12 تا 18 اپریل 2001ء

ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

☆ ڈیڑھ سو سالہ خدمات دیوبند کانفرنس - ایک اہم سنگ میل (اداریہ)

☆ جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی (خصوصی مضمون)

☆ پی ٹی وی - اسلامی روایات سے دوری کا سبب (ابلاغیات)

خصوصی اشاعت

بحوالہ

ڈیڑھ سو سالہ

خدمات دیوبند

کانفرنس

چودھویں صدی ہجری کا مجدد اعظم کون؟

"..... اس تحقیق و تفتیش کے دوران حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کے جو پہلو میری نگاہوں کے سامنے آئے وہ اس سے قبل خود میرے علم میں بھی نہ تھے۔ حالانکہ میں اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے ان کے ترجمۂ قرآن مع حواشی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے استفادہ کرتا رہا ہوں اور اس وجہ سے مجھے ان دونوں بزرگوں سے ایک گونہ تعلق خاطر حاصل تھا..... میری تحریر کا اصل محرک تو وہ تحریر خود بول رہی ہے کہ وہ شدت تاثر تھا جو حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کی عظمت کے انکشاف سے مجھ پر ہوا جس کی بنا پر میری یہ حتمی رائے بنی کہ چودھویں صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ الہندؒ تھے..... ساتھ ہی یہ احساس بھی ابھرا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت سے خود حلقۂ دیوبند کے علماء اور خصوصاً ان کی نوجوان نسل کی اکثریت پوری طرح واقف نہیں ہے..... یہی وجہ ہے کہ ان کے حلقوں میں حضرت شیخ الہندؒ کی بعض دوسری معاصر شخصیتوں کا چرچا ان کے مقابلے میں زیادہ ہے! (واضح رہے کہ میرا نوجوانی کے دور ہی سے حلقۂ دیوبند کے علماء سے رابطہ رہا ہے۔ جن دنوں میں ساہیوال میں مقیم تھا تو جامعہ رشیدیہ اور اس سے وابستہ علماء کرام سے شرف ملاقات حاصل ہوتا رہتا تھا۔ کراچی میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی خدمت میں حاضری کا بارہا اتفاق ہوا!..... اور لاہور میں جامعہ مدنیہ اور بالخصوص مولانا سید حامد میاں مدظلہ کی خدمت میں بحمد اللہ میری مسلسل حاضری رہتی ہے اور ان کے سامنے جب میں نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ چودھویں صدی ہجری کے مجدد اعظم حضرت شیخ الہندؒ تھے تو وہ بھی چونک سے گئے اور ان کا ردعمل تائیدی رنگ لئے ہوئے تھا!) اس تحریر کی دوبارہ اشاعت کا اصل محرک یہی خیال تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت سے لوگوں کو از سر نو متعارف کرایا جائے.....!"

(ڈاکٹر اسرار احمد کی کتاب 'جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی' سے ایک اقتباس)

اس شمارے کی قیمت 10 روپے

الھدیٰ

از : ڈاکٹر اسرار احمد

سورۃ البقرۃ (۱۲)

﴿ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ ﴾

''اور وہ قائم رکھتے ہیں نماز کو''۔

نماز یا صلوٰۃ کے اصل معانی دعا' مناجات' توجہ' عنایت' کسی کی طرف التفات اور اقدام وغیرہ ہیں۔ ''اقامت'' (اَقَامَ : يُقِيْمُ) کسی کو کھڑا کرنا' سیدھا کرنا' قائم کرنا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اقامت صلوٰۃ سے مراد ہے نماز کا ایک مکمل نظام قائم کرنا۔ یہ صرف ایسے ہی نہیں کہ جب جی چاہا تو کبھی مناجات کر لیں' نہیں جی چاہا تو نہ کیں' بلکہ اسے اپنی زندگی کے معمولات کے اندر مستقل پروگرام کی حیثیت سے شامل کرنا اور اس کا اس طرح التزام کرنا کہ انسان کی ایسی کیفیت ہو جائے کہ ۲۴ گھنٹے کے معمولات میں نماز گویا کھونٹے کی مانند ہو جائے یعنی کبھی کوئی ملاقات' کوئی پروگرام یا کوئی بھی اور معاملہ ہو' انسان اپنی پلاننگ اور نظام العمل نماز کو مدنظر رکھتے ہوئے بنائے۔

اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں سینکڑوں مرتبہ نماز قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت لقمان کے نصائح میں بھی ہے ﴿ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ﴾ ''اے میرے بچے نماز قائم کر''۔ ظاہر بات ہے اس وقت یہ نماز پنجگانہ نہیں تھی جو ہمیں محمد عربی ﷺ کے ذریعے سے ملی بلکہ مناجات و دعا وغیرہ کا کوئی سلسلہ ہو گا۔ واضح رہے کہ ہماری نماز کا جزو اعظم سورۃ الفاتحہ ہے جو دعا و مناجات پر مبنی قرآن مجید کی عظیم ترین سورت ہے۔ اس کے بارے میں حضرت ابی بن کعبؓ کے حوالے سے حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اس جیسی سورت تورات میں نازل ہوئی نہ انجیل میں' نہ زبور میں اور نہ ہی خود قرآن میں اس کی نظیر موجود ہے۔ بہرکیف ہمارے پاس نماز کا باقاعدہ نظام دور نبویؐ سے چلا آ رہا ہے' پنج وقتہ نماز کے اوقات اور اس کے قواعد اور قوانین سے پوری امت واقف ہے۔ نماز کا یہ نظام مکی دور میں ہی محمد عربی ﷺ کو شب معراج میں تفصیل کے ساتھ عطا فرما دیا گیا تھا۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہی ہمارا خالق' مالک اور رب ہے اس کی طرف لوٹ کر بھی جانا ہے اور اس کی طرف سے جزا و سزا ہو کر رہے گی تو پھر اس سے ایک تعلق اور ذہنی رابطہ قائم کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی مناجات کا نظام ہونا چاہئے۔ اقبال کا شعر ہے ۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

انسان اپنے معمولات' زندگی کی ضروریات اور مشغولیات میں مصروف ہو کر بھول جاتا ہے اور بعض اوقات' رب سے ذہنی رابطہ منقطع ہونے کے قریب آ جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں اس تعلق کو تازہ کرنے اور اس کو از سر نو اجاگر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ قلب کے اندر اس کے ادراک اور شعور کو زندہ کیا جائے۔ درحقیقت یہ نماز ہی ہے جس کے ذریعے ہم دن میں پانچ مرتبہ اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز کرتے اور اس سے کئے ہوئے قول و قرار اور عہد بندگی کو تازہ کرتے ہیں۔ حفیظ جالندھری کا بڑا پیارا شعر ہے ۔

سرکشی نے کر دیئے دھندلے نقوش بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوح جبیں تازہ کریں

فرمان نبوی

از : چوھدری رحمت اللہ بٹر

جماعت کی اہمیت

عَنِ الْحَارِثِ الْاَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ « آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاِنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ الْاِسْلَامَ مِنْ عُنُقِهِ اِلَّا اَنْ يُّرَاجِعَ وَمَنْ دَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ فَهُوَ مِنْ جُثَى جَهَنَّمَ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَ زَعَمَ اَنَّهُ مُسْلِمٌ »

(رواہ احمد والترمذی)

''حضرت حارث اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانو! میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں کہ التزام جماعت اختیار کرو اور پھر جماعت کا حکم سنو اور مانو اور اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کرو' اور جان لو جو کوئی جماعت سے ایک بالشت بھر بھی علیحدہ ہوا تو اس نے گویا اسلام کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا' مگر یہ کہ وہ واپس جماعت میں لوٹ آئے' اور جس کسی نے جاہلیت کی پکار (خاندانی' نسلی' لسانی' علاقائی عصبیت) پر لوگوں کو جمع کیا اور جماعت بنانے کی کوشش کی تاکہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالے تو وہ جہنم کا ایندھن ہو گا اگرچہ وہ روزے رکھتا ہو' نماز ادا کرتا ہو اور خود کو مسلمان گردانتا ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو مبعوث ہی اس لئے فرمایا کہ اللہ کے دین کو غالب کیا جائے اور اللہ کی کبریائی کو نافذ کیا جائے۔ اور یہ اس صورت میں ممکن ہوا کہ مسلمانوں نے ایک ایسی مضبوط جماعت کی شکل اختیار کی جس میں اطاعت امیر کا اصول اہم ترین تھا اور اس جماعت کا نظم وضبط اور ڈسپلن مثالی تھا۔ اور پھر مسلمانوں نے ہجرت و جہاد کی منزلیں طے کیں۔ اللہ کا یہ دین اسی صورت میں ہی قائم رہ سکتا تھا کہ مسلمان متحد رہتے اور ایک جماعت کی صورت میں زندگی گزارتے اور اللہ کی نافرمانی سے بچتے اور اللہ کی اطاعت پر کاربند رہتے۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے ان باتوں کا تاکیدی حکم دیا۔ جب تک مسلمانوں نے ان باتوں کا التزام کیا اللہ کا دین غالب رہا لیکن جب جماعت بکھر گئی اور لوگوں نے اسلام کے علاوہ عصبیتیں اجاگر کر کے طائف الملوکی اختیار کر لی تو دین مغلوب ہو گیا اور مسلمان دوسروں کے ماتحت ہو گئے۔ اب اگر دوبارہ اسلام کا غلبہ مطلوب ہے تو پھر ان ہی باتوں پر عمل کرنا ہو گا اور دوبارہ نظام خلافت قائم کرنا ہو گا' وگرنہ اللہ تعالیٰ کو دین کی مغلوبیت کی حالت میں مسلمانوں کی نمازیں اور روزے فی الاصل مطلوب نہیں ہیں! بلکہ اصل تقاضا یہ ہے کہ وہ دین کو قائم و غالب کرنے کے لئے اجتماعی جدوجہد کریں۔ جس کا عملی طریقہ یہی ہے کہ جماعتی زندگی اختیار کریں' نظم وضبط اور جماعتی ڈسپلن کی پابندی کریں اور ہجرت و جہاد کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریک خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ لاہور

ندائے خلافت

جلد 10 شمارہ 12

12 تا 18 / اپریل 2001ء

بانی : اقتدار احمد مرحوم

مدیر: حافظ عاکف سعید

نائب مدیر: فرقان دانش خان

معاونین: مرزا ایوب بیگ ' مرزا ندیم بیگ
نعیم اختر عدنان ' سردار اعوان
انور کمال میو

نگران طباعت : شیخ رحیم الدین

پبلشر: اسعد احمد مختار ' طابع: رشید احمد چوہدری
مطبع: مکتبہ جدید پریس ' ریلوے روڈ ' لاہور
مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: 03-5869501 فیکس: 5834000
E-Mail:anjuman@tanzeem.org
Website:www.tanzeem.org

قیمت فی شمارہ : 5 روپے
(اس شمارے کی قیمت 10 روپے)

زرتعاون (اندرون پاکستان) :
سالانہ 225 روپے ' ششماہی 120 روپے

سالانہ زرتعاون (بیرون پاکستان):
☆ ایران ' ترکی ' اومان ' مسقط ' عراق ' الجزائر ' مصر
700 روپے (12 امریکی ڈالر)
☆ سعودی عرب ' کویت ' بحرین ' قطر ' امارات ' بھارت '
بنگلہ دیش ' افریقہ ' ایشیا ' جاپان ' یورپ
900 روپے (15 امریکی ڈالر)
☆ امریکہ ' کینیڈا ' آسٹریلیا ' نیوزی لینڈ
1400 روپے (25 امریکی ڈالر)

اداریہ

حافظ عاکف سعید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ڈیڑھ صد سالہ خدمات دیوبند کانفرنس ـــــ ایک اہم سنگ میل

جمعیت علمائے اسلام (ف) کے زیر اہتمام ڈیڑھ صد سالہ خدمات دیوبند کانفرنس ۱۱ تا ۱۳ / اپریل پشاور میں منعقد ہو رہی ہے۔ دنیا بھر سے مسلمان علماء' سکالرز اور مدارس دینیہ کے طلبہ اس کانفرنس میں شرکت کے لئے پشاور پہنچیں گے۔ توقع یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑا اجتماع ہوگا اور پاکستان میں نفاذ اسلام اور اس میں علماء کرام کے موثر کردار کے حوالے سے یہ اجتماع نہایت مثبت اور دوررس نتائج کا حامل ہوگا۔

امیر تنظیم اسلامی اور داعی 'تحریک خلافت پاکستان' محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا یہ موقف آج کا نہیں' ربع صدی پرانا ہے اور اسے انہوں نے زبان و بیان اور قلم و قرطاس کے تمام ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے بھرپور انداز میں خواص و عوام تک پہنچایا ہے کہ مسلمانان برعظیم پاک و ہند کی گذشتہ چار سو سالہ تاریخ اس اعتبار سے نہایت تابناک اور قابل رشک ہے کہ اس عرصے کے دوران امت میں تجدیدی مساعی کا مرکز و محور یہی خطہ زمین رہا۔ گیارہویں صدی ہجری میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ذریعے جس عظیم الشان تجدیدی سلسلے کا آغاز ہوا اس کا تسلسل بعد میں بھی جاری رہا ـــــ بارہویں صدی ہجری کے مجدد' حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہوں یا تیرہویں صدی کے مجدد' عظیم مجاہد حریت سید احمد شہید بریلویؒ سب کا تعلق اسی سرزمین سے ہے' جس کے بارے میں علامہ اقبال نے بجا طور پر کہا ہے کہ "میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے- میرا وطن وہی ہے' میرا وطن وہی ہے۔" چودھویں صدی کے مجدد کے بارے میں آراء کا اختلاف ہے لیکن امیر تنظیم اسلامی کے نزدیک اس صدی کے مجدد اعظم شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ہیں ـــــ ہمارے نزدیک دارالعلوم دیوبند کی اصل اہمیت یہ ہے کہ یہ مسلمانان ہند کی چار صد سالہ تجدیدی مساعی اور درخشاں روایات کا امین اور وارث ہے۔ دیوبند نامی قصبے میں قریباً ڈیڑھ سو سال قبل ایک درخت کے سائے تلے ایک استاد اور ایک شاگرد سے شروع ہونے والی اس درسگاہ نے بہت جلد ایک عظیم تحریک کی صورت اختیار کر لی جہاں علم دین کے فروغ کے کار خیر کے ساتھ ساتھ شاہ ولی اللہؒ کے انقلابی افکار کا عملی اظہار انگریز کے خلاف جہاد حریت کی صورت میں جلوہ گر ہوا اور اس طرح دیوبند کو سرزمین ہند کے دینی مدارس میں ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہو گیا۔

اس بحث سے قطع نظر کہ وابستگان دیوبند نے قیام پاکستان کے بعد یہاں انتخابی سیاست کے اکھاڑے میں کود کر پاکستان میں گذشتہ نصف صدی سے رائج انگریز کے چھوڑے ہوئے فرسودہ استحصالی باطل نظام کی بیخ کنی اور غلبہ و اقامت دین کے حوالے سے کیا پایا اور کیا کھویا' یہ بات نہایت خوش آئند ہے کہ افغانستان میں امارت اسلامی کے قیام کا سہرا جن 'طالبان' کے سر ہے' وہ سب پاکستان کے انہی دینی مدارس کے فیض یافتہ ہیں جن کا سلسلہ دارالعلوم دیوبند سے جڑتا ہے۔ گویا حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نفس گرم کی تپش' شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے انقلابی افکار کی حدت' سید احمد شہیدؒ کے جذبہ جہاد کی سوزش اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی مجاہدانہ اور مجددانہ مساعی کے اثرات افغانستان میں اس شان کے ساتھ ظاہر ہوئے کہ وہاں اللہ کا کلمہ فی الواقع سربلند ہوا اور اللہ کا دین حقیقی معنوں میں دیگر تمام نظام ہائے باطل پر غالب و حاوی ہو گیا ـــــ اور یوں اس خطہ زمین میں جو کبھی خراسان قدیم کا حصہ تھا' نظام خلافت کی داغ بیل پڑ گئی۔

ہمارے نزدیک حالیہ دیوبند کانفرنس کا طالبان کے افغانستان سے ملحق و متصل پاکستان کے ایک تاریخی شہر پشاور میں انعقاد نہایت معنی خیز اور خوش آئند ہے۔ اللہ کرے کہ یہ عظیم اجتماع' پاکستان میں غلبہ دین اور نفاذ شریعت کا پیش خیمہ ثابت ہو' تاکہ افغانستان اور پاکستان مل کر نظام خلافت کے عالمی سطح پر احیاء و قیام کے ضمن میں اپنا وہ فیصلہ کن کردار ادا کر سکیں جس کی جانب واضح اشارات متعدد صحیح احادیث میں ملتے ہیں۔ اللھم وفقنا لھذا

دینی جذبہ کے سوا کوئی شے پاکستان کو استحکام نہیں دے سکتی

مسجد دارالسلام باغ جناح' لاہور میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے ۳۰ مارچ ۲۰۰۱ء کے خطاب جمعہ کی تلخیص

حمد وثناء' تلاوت آیات اور ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا:

اس ہفتے لاہور میں بعض اعتبارات سے ایک عجیب تقریب منعقد ہوئی۔ عجیب اس اعتبار سے کہ ''تحریک استحکام پاکستان'' نامی ایک ادارہ برطانیہ کے پاکستانیوں نے قائم کیا ہے۔ انہوں نے ۲۵ مارچ کو ایوان اقبال لاہور میں پورے دن کی استحکام پاکستان کانفرنس منعقد کی۔

اس تحریک کے روح رواں عبدالکریم ثاقب صاحب ہیں' جن کا تعلق لاہور سے ہے۔ وہ کافی عرصہ سے لندن میں مقیم ہیں۔ مدینہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل بھی ہیں۔

میں اس کنونشن میں شام کے اجلاس میں گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ برطانیہ کے تارکین وطن پاکستانیوں کو ملک کے استحکام کے بارے میں ہم سے زیادہ تشویش ہے۔ یہ معاملہ محض تشویش تک محدود نہیں ہے بلکہ انہوں نے فی الواقع اس ضمن میں مثبت اقدام کا آغاز بھی کر دیا ہے۔

میں نے وہاں دوٹوک بات کہی کہ ہمیں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ پاکستان کے استحکام کی واحد اساس صرف اور صرف ''اسلام'' ہے۔ اس بات کا جس گہرائی کے ساتھ شعور و ادراک ہونا چاہئے وہ ہمارے ہاں اسلام سے لگاؤ رکھنے والے لوگوں کی اکثریت کو بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ اقبال نے کہا تھا ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

اقبال نے تو یہ بات عالمی ملت اسلامیہ کے بارے میں کہی لیکن فی الحقیقت مسلمان ممالک میں بھی صرف پاکستان کے بارے میں یہ بات صد فی صد پوری اترتی ہے کیونکہ دوسرے مسلم ممالک کے استحکام کی دوسری بنیادیں بھی ہیں جبکہ پاکستان کے لئے اپنی بقاء و استحکام کی کوئی اور بنیاد سوائے اسلام کے ہے ہی نہیں!۔

اگر ہم کسی ملک کے استحکام کی بنیادوں کا تجزیہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس حوالے سے ایک بنیاد تاریخی تقدس ہوتا ہے' جیسے چین جو دنیا کے نقشے پر اس وقت سے ہے جب سے دنیا کی تاریخ انسان کے علم میں ہے۔ اس کے ایک حصے پر ایک طویل عرصہ تک جاپان قابض رہا لیکن وہ مقبوضہ علاقہ کبھی بھی جاپان کا حصہ نہیں سمجھا گیا بلکہ دنیا اسے ہمیشہ چین کا حصہ ہی شمار کرتی رہی۔ جرمنی دو حصوں میں بٹ گیا لیکن کسی ایک حصے نے بھی جرمنی کے نام کو ترک نہیں کیا بلکہ دو جرمنی وجود میں آ گئے۔ اسی طرح کا معاملہ یمن اور کوریا کا ہوا۔ ہمیں یہ تقدس بھی حاصل نہیں کیونکہ ۱۹۴۷ء سے پہلے یہ ملک دنیا کے نقشے پر موجود نہ تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۱ء میں جب پاکستان دولخت ہوا تو اس کے مشرقی بازو نے 'پاکستان' کے نام کو اتنا بے وقعت اور حقیر سمجھا کہ اپنے ماتھے پر سے اس کا لیبل اتار کر خلیج بنگال میں غرق کر دیا۔ کسی ملک کے استحکام کا دوسرا عامل جغرافیائی ہوتا ہے یعنی کسی ملک کو کسی پہاڑی یا دریائی سلسلے کے باعث ایک قدرتی تحفظ حاصل ہوتا ہے' جیسے ہندوستان (بھارت) کو سلسلۂ کوہ ہمالیہ کی وجہ سے شمال کی طرف سے تحفظ حاصل ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی حاصل نہیں۔ ہمارے پیدائشی دشمن بھارت کے ساتھ ہماری سرحد انتہائی غیر فطری اور جغرافیہ کے ہر اصول کے مخالف ہے۔ استحکام کا تیسرا عامل کوئی عصبیت یا انسانی جذبہ ہوتا ہے جو کسی قوم کو جوڑتا ہے۔ دنیا میں دو ہی عصبیتیں موجود ہیں: ایک قومی عصبیت' دوسرے مذہبی عصبیت۔

جرمن قوم اپنے قومی فخر یعنی نسلی برتری کے احساس کے باعث بار بار کچلے جانے کے باوجود اپنے پیروں پر کھڑی ہے' اسی طرح یہود ایک نسلی مذہب سے وابستگی کے باعث نسلی عصبیت کے سہارے کئی بار تباہ و برباد ہو کر بھی دوبارہ کھڑے ہو گئے۔

اس کے علاوہ لسانی قومیت بھی کسی ملک کے استحکام کا ایک طاقتور قومی جذبہ ہوتی ہے۔ عرب نیشنلزم اور بنگلہ نیشنلزم اس کی دو قابل ذکر مثالیں ہیں۔ لیکن ہمارے پاس کل پاکستان کی بنیاد پر کسی لسانی قومیت سے پیدا شدہ جذبہ عمل تو درکنار تا حال ''قومی زبان'' کے مسئلے کا حل بھی موجود نہیں۔ اردو تا حال ہماری قومی زبان بن سکی ہے نہ بن سکے گی۔ یہی لسانی جھگڑا مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی بنیاد بنا تھا اور یہی چیز سندھی نیشنلزم کی بنیاد ہے۔

قومیت کی ایک بنیاد وطنی قومیت بھی ہے' جو پچھلی صدی کی ایجاد ہے۔ لیکن وطنی قومیت پاکستان کی اساس ہرگز نہیں بن سکتی کیونکہ وطنی قومیت کی کامل نفی پر ہم نے یہ ملک قائم کیا تھا۔ اس پر اس ملک کے استحکام کی بنیاد کیسے رکھ جا سکتی ہے؟

چونکہ مسلمان مزاجاً زمین سے بندھنے والا نہیں ہے بلکہ آفاقی مزاج رکھنے والا ہے لہٰذا ہمارے پاس دینی جذبہ یا دینی عصبیت کے سوا کوئی شے استحکام کے لئے موجود نہیں۔ یہی دینی جذبہ اس کے قیام کی وجہ بنا۔ تاہم وہ مذہبی جذبہ جس نے یہ ملک بنایا اور جو دینی جذبہ اس کے استحکام کے لئے ضروری ہے اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ قیام پاکستان کے وقت محض نام کا اسلام بھی کام دے گیا تھا کیونکہ مقابلہ میں ہندو کا خوف تھا لیکن آج اس کے استحکام کے لئے حقیقی دینی جذبہ کی ضرورت ہے۔ استحکام پاکستان کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہاں اسلام کا عادلانہ نظام اجتماعی قائم کرنے کے ساتھ ساتھ قانون شریعت کی تنفیذ بھی کریں۔ بحمد اللہ ملک میں نفاذ شریعت کے ضمن میں آئینی و دستوری سطح پر اتنا کام ہو چکا ہے کہ کوئی بھی حکمران اگر نیک نیتی کے ساتھ اس کام کی طرف توجہ دے تو اسے کوئی دقت پیش نہیں آئے گی جبکہ ملک میں اسلامی نظام کے قیام کا دوسرا آسان راستہ یہ ہے کہ دینی جماعتیں کشمکش اقتدار اور انتخابات کی سیاست سے الگ رہتے ہوئے متحد ہو کر بھرپور احتجاجی تحریک چلائیں تو چند ہفتوں کے اندر اندر اسلامی انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوا تو پھر دین قائم کرنے کے خواہش مند افراد کو کل کر حضورؐ کے طریقے پر ایک انقلابی جماعت تشکیل دینا ہوگی اور اسلام کو پہلے خود اپنی ذات پر نافذ کر کے نہی عن المنکر کی ایک موثر تحریک چلانا ہوگی۔

ہم نے یہ ملک قائم کرتے ہوئے اللہ سے یہاں دین قائم کرنے کا وعدہ کیا تھا جسے پورا نہ کرنے کی سزا میں آج پوری قوم پر عذاب الٰہی کے طور پر نفاق مسلط کر دیا گیا ہے۔ مذہبی فرقہ واریت' صوبائیت پرستی' قومی اتحاد کا فقدان اور باہمی عدم اعتماد کی فضا اسی نفاق کا مظہر ہیں۔ صرف اسلام ہی ہمیں لسانی و صوبائی تعصب سے بالاتر کر کے ایک مضبوط قوم کی شکل دے سکتا ہے۔

آخر میں' میں ایک قرارداد پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ملک کی نامور دینی شخصیت' معروف شیخ طریقت' عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی نائب امیر سید نفیس الحسینی دامت برکاتہم (المعروف نفیس رقم) کی خانقاہ اور گھر پر ایبلیٹ فورس

(باقی صفحہ 18 نمبر 1 پر)

دارالعلوم دیوبند کانفرنس طالبان کی اسلامی حکومت کی تقویت کا باعث بنے گی

مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے ۶ اپریل ۲۰۰۱ء کے خطاب جمعہ کی تلخیص

دورۂ مسقط کے تاثرات

حمد وثنا اور ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا:

ابتداء میں اپنے دورۂ مسقط کے تاثرات بیان کرنا چاہتا ہوں۔ سلطنت عمان کے دار الحکومت مسقط کا یہ میرا پہلا دورہ ہے جو اسی ہفتے میں نے تین دن کا کیا۔ عمان کی کل آبادی ۲۰ لاکھ ہے۔ وہاں تیل بھی کچھ زیادہ نہیں البتہ گیس کے ذخائر بہت ہیں۔ ہر چوک پر فلائی اوور اور مسجدیں بے تحاشا ہیں۔ بے پردگی و بے حیائی بہت کم ہے۔ وہاں کے مسلمان خوارج کی باقیات میں سے ہیں۔ تاہم ان کی نماز کی ترتیب ہم سے ملتی ہے۔ وہ رفع یدین کی کامل نفی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی عبادات میں خاص فرق نظر نہیں آیا۔ اچھا ماحول ہے' مساجد آباد ہیں۔ وہاں ہندو کافی تعداد میں ہیں۔ مندر اور چرچ بھی ہیں۔ عمان کی حکومت شہریت آسانی سے دے دیتی ہے۔ وہاں کئی مقام پر میری تقریریں ہوئیں۔ کئی لوگ بیعت کر کے تنظیم میں شامل ہو چکے ہیں اور بحمد اللہ تنظیم اسلامی کا حلقہ وجود میں آ گیا ہے۔

حدیث جبریل میں قیامت کی جو دو علامات بیان ہوئی ہیں۔ ان میں ایک علامت عمان میں بھی نظر آتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا قیامت کی نشانیوں میں سے دو یہ ہیں:

(۱) کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی۔

(۲) تم دیکھو گے کہ وہ چرواہے جن کے پاؤں میں جوتے نہیں تھے' جن کے بدن پر لباس نہ تھا وہ اونچی اونچی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گے۔

اس دوسری علامت کا واضح نظارہ امارات کے علاقے میں ہوتا ہی ہے اس کا مظاہرہ مسقط میں بھی نظر آیا۔

ایک بہت گہرا تاثر یہ ہوا کہ میرے دروس قرآنی کے کیسٹ پوری دنیا میں پھیلے ہیں۔ بالخصوص بھارت سے تعلق رکھنے والے عمان کے شہریوں نے بتایا کہ میرے دروس قرآن کے ویڈیو کیسٹ بھارت کے مختلف علاقوں میں کیبل کے ذریعے دکھائے جاتے ہیں۔ گویا اللہ کے فضل سے ہمارے ذریعے قرآن کی انقلابی دعوت پوری دنیا میں عام ہو رہی ہے اور امید ہے کہ یہ دنیا میں ضرور کہیں نہ کہیں اپنا اثر دکھائے گی۔

دارالعلوم دیوبند کانفرنس

میں آج کے اجتماع جمعہ میں ۹ تا ۱۱/اپریل ۲۰۰۱ء پشاور میں ہونے والی دیوبند کانفرنس بھی کے حوالے سے چند گزارشات رکھنا چاہتا ہوں۔ دیوبند کے ایک درخت کے نیچے سے شروع ہونے والے اس مدرسہ نے اب ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے۔ تحریک دیوبند کا آج اثر یہ ہے کہ اس کے زیر اثر پاکستان میں قائم کئی مدارس تو یونیورسٹیوں کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ جن میں جامعہ فاروقیہ' دار العلوم کورنگی کراچی' مدرسہ بنوری ٹاؤن کراچی' مدرسہ حقانیہ اکوڑہ خٹک' جامعہ اشرفیہ اور جامعہ مدنیہ لاہور

ایک درخت کے نیچے شروع ہونے والا مدرسہ

ایک عظیم تحریک کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ ان کے علاوہ لاتعداد مدارس پاکستان اور ہندوستان کے طول وعرض میں قائم ہیں جنہیں دار العلوم دیوبند کی سرپرستی حاصل ہے۔ میں ان مدارس کو دار العلوم دیوبند کی بیٹیاں کہا کرتا ہوں۔ طالبان بھی اکثر و بیشتر دیوبند کے انہی مدارس سے فارغ التحصیل ہیں جنہوں نے افغانستان میں اسلامی حکومت قائم کی ہے اور عزم و ہمت کی نئی تاریخ رقم کی ہے۔ اس اعتبار سے پشاور میں ہونے والی دیوبند کانفرنس ایک عظیم واقعہ ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ کانفرنس طالبان حکومت کی تقویت کا باعث بنے گی۔

اس عظیم درسگاہ کے پہلے مدرس ملا محمود دیوبندی اور پہلے شاگرد محمود حسن تھے۔ شاگرد محمود حسن بعد میں اس ادارے کے صدر مدرس بھی بنے اور شیخ الہند کا لقب پایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ دار العلوم دیوبند دراصل تحریک شہیدین کا تسلسل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا محمود حسنؒ نے انگریز اور انگریزیت کا بائیکاٹ کیا اور اس کے خلاف تحریک چلائی۔ اس جرم کی پاداش میں انہیں گرفتار کر کے مالٹا میں رکھا گیا کہ کہیں ان کے نفس گرم کی گرمی جیل کی دیواروں سے باہر نکل کر بھارت کے مسلمانوں تک نہ پہنچ جائے۔ یہاں آپ تقریباً ۵ برس قید رہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب آپ رہا ہو کر واپس آئے تو آپ کی سیاسی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جمعیت علمائے ہند کے صدر مولانا عبد الباری اور موہن داس کرم چند گاندھی آپ کا استقبال کرنے کے لئے بمبئی پہنچے۔ اس سیاسی حیثیت کے علاوہ مولانا محمود حسنؒ بہت بڑے مجاہد آزادی (Freedom Fighter) کے طور پر معروف تھے۔ تاہم ان کی ایک حیثیت ابھی تک لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے وہ یہ کہ میرے نزدیک آپ چودھویں صدی کے مجدد اعظم ہیں۔

حضور ﷺ کے بعد سے قیامت تک ختم نبوت کے باعث جو خلا واقع ہوا اس کو اللہ تعالیٰ نے تین چیزوں سے پر کیا۔

۱۔ قرآن کے متن کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔

۲۔ ہر صدی میں مجددین کی آمد کا سلسلہ جاری فرما دیا تاکہ دین کے چہرے پر پڑنے والی گرد ہٹائی جاتی رہے۔

۳۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں ایک گروہ ہمیشہ ضرور حق پر قائم رہے گا۔

البتہ اس حدیث سے ایک غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ شاید صرف کوئی ایک جماعت ہی حق پر قائم رہے گی۔ ایسا نہیں ہے کیونکہ ہر مجدد کے اعوان و انصار کی جماعت تو حق پر ہوتی ہے لیکن تیسری نسل تک یہ جماعت موروثی اور فرقہ واریت کی علمبردار بن جاتی ہے تب اللہ کسی اور مجدد کو کھڑا کر دیتا ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

اس تمہید سے جو بات بتانا میرے پیش نظر ہے وہ حضرت شیخ الہند کی آخری خواہش ہے جسے آپ کے شاگردوں نے بھی اہمیت نہیں دی۔ آپ نے اپنی رہائی کے بعد یہ تجویز پیش کی تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند مان کر انگریز کے خلاف جہاد کیا جائے۔ چونکہ مولانا ابوالکلام کسی مدرسے سے فارغ التحصیل نہ تھے اس لئے شیخ الہند کے شاگردوں اور ہم عصر علماء نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ ویسے بھی رہائی کے بعد آپ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے' اس لئے اس تجویز پر عمل نہ ہو سکا۔ بعد ازاں مولانا ابوالکلام بھی طبقہ علماء سے مایوس ہو کر کانگریس میں شریک ہو گئے۔

(باقی صفحہ 18 نمبر 2 پر)

امریکہ چین تنازعہ ــــ ہمارے لئے لمحۂ فکریہ!

تجزیہ نگار کے نقطۂ نظر سے ادارہ کا کلی اتفاق ضروری نہیں

ابوالحسن

تاریخ میں بہت سی اقوام نے سپر پاور یا سپریم پاور کی حیثیت اختیار کی' جن میں ایران' روما' مسلمان' برطانیہ اور امریکہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے مسلمان اگرچہ تاریخ میں طویل ترین عرصے کے لئے سپر پاور کی حیثیت سے رہے لیکن بحیثیت سپر پاور جو موثر اور زور آور رول امریکہ دنیا میں ادا کر رہا ہے وہ یقینا تاریخ میں کوئی اور سپر پاور ادا نہیں کر سکی جس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ سائنس کی معجزہ نما ترقی نے ذرائع ابلاغ اور مواصلات کو اتنا حساس اور تیز رفتار بنا دیا ہے کہ دنیا سکڑ کر ایک گاؤں کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ دنیا کے ایک کنارے پر کھڑا انسان دوسرے کنارے پر کھڑے انسان کو یوں دیکھ سکتا ہے اور بات کر سکتا ہے جیسے آمنے سامنے کھڑے لوگ دیکھتے ہیں اور بات کرتے ہیں۔ سپر سونک یعنی آواز سے تیز رفتار طیارے ادھر سے ادھر سفر کرتے ہیں۔ لہٰذا ماضی کی سپر پاورز کی طرح امریکہ کی عسکری طور پر ہر جگہ موجودگی لازم نہیں۔ اس نے دنیا بھر میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کا جال بچھایا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں مصنوعی سیارے اسے گھر بیٹھے دنیا بھر کی رپورٹیں ارسال کرتے ہیں۔ ان رپورٹس کی روشنی میں وہ پاکستان جیسے غریب اور مقروض ممالک کی تو قسمت کے فیصلے کرتا ہے لیکن یورپی ممالک' جاپان' چین اور بھارت جیسے اقتصادی اور عسکری لحاظ سے مضبوط ممالک کی پالیسیوں پر بھی اچھا خاصا اثر انداز ہوتا ہے۔ بہرحال وہ موجودہ صورتحال سے مطمئن نہیں اور اپنے بعض حلیفوں کی مدد سے دنیا پر بالواسطہ حکمرانی کی خواہش رکھتا ہے۔ ۱۹۹۰ء میں خلیج کی جنگ جیتنے کے بعد امریکہ کے موجودہ صدر جونیئر بش کے والد جارج بش جو اس وقت امریکہ کے صدر تھے انہوں نے اس امریکی خواہش کو نیو ورلڈ آرڈر کا نام دیا تھا۔ ان کے بعد بل کلنٹن امریکہ کے صدر بنے۔ انہوں نے بھی اگرچہ امریکہ کی عالمی حاکمیت کے نظریئے پر کام کیا لیکن ان کا انداز یہ تھا کہ وہ یہ ہدف حاصل کرنے سے پہلے دنیا کے بڑے بڑے تنازعات ختم کر کے امن کا پیغامبر بننا چاہتے تھے لیکن انصاف کی بنیاد پر نہیں بلکہ ''ڈاڈے کا ستی وی سو'' (یعنی زبردست کی قوت) کی بنیاد پر چنانچہ اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان کسی معاہدے کے لئے اور اپنے دور صدارت کا اکثر و بیشتر حصہ صرف کیا انہوں نے پاک بھارت تنازعات کو ختم کرانے کی بھی خاصی کوشش کی وغیرہ وغیرہ۔

جارج بش نیو ورلڈ آرڈر کے نظریہ کے خالق تھے' آج ان کا بڑا بیٹا جونیئر بش امریکہ کا صدر ہے۔ اگرچہ پاکستان کی طرح امریکہ میں ''اباجی'' فیکٹر زیادہ موثر نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی تین ماہ بعد جو صورت حال نظر آ رہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بش کلنٹن کی طرح صلح صفائی میں وقت ضائع نہیں کریں گے۔ وہ اپنے فیصلے نافذ کریں گے اور اس کے لئے طاقت سمیت ہر قسم کے حربے استعمال کریں گے۔ عراق جسے ان کے والد کے دور حکومت میں عبرت کا نشان بنایا گیا تھا' صدارت کا عہدہ سنبھالتے ہی اس پر بمباری کی گئی۔ کلنٹن دور میں یاسر عرفات اور اسرائیل کے ایہود بارک ہر دوسرے دن واشنگٹن پہنچے ہوتے تھے لیکن اس وقت اسرائیل کے وزیر اعظم واشنگٹن یاترا پر ہیں جبکہ بیچارے یاسر عرفات حاضری کے اجازت نامے کے انتظار میں منہ لٹکائے بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ اس معاملے میں بھی یک طرفہ فیصلہ سنانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ چین کے ساتھ جہازوں کے ٹکرانے کا نیا تنازعہ کھڑا ہوا ہے۔ اس میں بھی امریکہ کا رویہ بڑا متکبرانہ ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ چونکہ یہ تصادم چینی فضائی سرحدوں کے قریب ہوا ہے' پھر یہ کہ اس میں چین کا ایک جہاز تباہ ہو گیا اور پائلٹ کی لاش نہیں مل رہی لہٰذا امریکہ نہ صرف اس حادثے پر افسوس کا اظہار کرتا بلکہ چین سے معافی طلب کرتا اور اس کے نقصان کی تلافی کرتا۔ امریکہ اس بات کی بھی پرواہ نہیں کر رہا کہ یہ تنازعہ پاکستان جیسے کسی غریب' مقروض اور پسماندہ ملک سے نہیں بلکہ چین جیسی ابھرتی ہوئی قوت سے ہے جس نے سرخ انقلاب کے بعد عالمی معاملات میں کمزوری کا اظہار نہیں کیا۔ پھر یہ کہ امریکہ کے اپنے ۲۴ فوجی جوان اس حادثہ کی وجہ سے یرغمال بنے ہوئے ہیں۔

امریکہ نے جب سے سپریم قوت کی حیثیت اختیار کی ہے اس کا رویہ عجیب و غریب ہو گیا ہے۔ اس کے رویئے کو اگر زبان دی جائے تو کچھ یوں ہے کہ دنیا میں صحیح معنوں میں انسان کہلانے کے حقدار صرف امریکی ہیں۔ یا وہ کسی قدر رعایت اپنے یورپی حلیفوں کو دیتا ہے۔ یورپ کے بارے میں بھی اس کی اصل خواہش یہ ہے کہ وہ امریکہ کے مفادات کو ترجیح دیں۔ باقی تمام دنیا کے انسان تو کیڑے مکوڑوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رچرڈ نکسن جو امریکہ کے سابق صدر ہیں' انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں خلیج کی جنگ میں موجودہ صدر کے والد جارج بش کی پالیسی کی بہت تعریف کی ہے۔ لیکن فرماتے ہیں کہ اس جنگ کا ایک بہت بڑا نقصان ہوا جس کی تلافی کبھی نہیں ہو سکتی۔ وہ نقصان یہ تھا کہ اس جنگ میں ۱۵۰ امریکی فوجی مارے گئے۔ عراق کا جو حشر ہوا اور انسانیت کی جس طرح تذلیل کی گئی اس کا کتاب میں کوئی ذکر نہیں۔ امریکہ دنیا کے ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا اپنا حق سمجھتا ہے جبکہ دوسروں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ امریکی نقطۂ نظر سے سوچیں اور اس کے مفاد میں عمل پیرا ہوں۔

امریکہ کا بحیثیت سپریم پاور اس متکبرانہ رویئے کا ذکر اس لئے تفصیل سے کیا جا رہا ہے کہ ہم سوچیں کہ یہ عظیم متکبر قوت اس وقت پاکستان کو اپنی چند خواہشات کی تکمیل کے راستے میں حائل تصور کر رہی ہے اور اس وقت امریکہ کی عنان حکومت ایک ایسے فرد کے پاس ہے جو امریکہ کے مفادات کو بذریعہ قوت حاصل کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتا۔ پاکستان ایک ایسے بکری کے بچے کی مانند ہے جس کے خلاف جنگل کا بادشاہ شیر غضبناک ہو کر دھاڑے۔ اس صورتحال میں جان کیسے بچائی جا سکتی ہے؟ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آنکھیں بند کر لینے سے یا وقتاً فوقتاً منت سماجت کرنے سے ہم اپنا وقت نکالتے جائیں گے تو یقیناً ہم بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ امریکہ ایک درندے کی صورت اختیار کر چکا ہے اور وہ اپنے مفادات کے راستے میں آنے والی ہر شے کو چیر پھاڑ دینے پر تیار ہے۔ بھارت جو ہمارا پیدائشی اور ازلی دشمن ہے' وہ اس مخالفت اور دشمنی کو ہوا دے رہا ہے اور امریکہ کے گرین سگنل پر ہمارے خلاف بھرپور تیاریاں کر رہا ہے۔ اس سے ہمارا مقصد قطعی طور پر یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی قوم کو خوف زدہ کر دیں لیکن یہ ہمارا دینی اور

(باقی صفحہ 21 پر)

دارالعلوم دیوبند —— ایک جائزہ' ایک تعارف

دیوبند ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش کے ضلع سہارن پور میں ایک قدیم قصبہ ہے۔ یہاں ایک چھوٹی سی مسجد میں' جسے چھتہ کی مسجد کہتے ہیں' ایک انار کا درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ٹھیک دس سال بعد ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء بمطابق ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ ہجری کو مشہور عالم دین مولانا محمد قاسم نانوتوی نے تین متقی اور فاضل بزرگوں سے مشاورت کی اور دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ یہ تین بزرگ حاجی سید عابد حسینؒ' مولانا ذوالفقار علیؒ اور مولانا فضل الرحمٰنؒ تھے۔ یہ تینوں بزرگ مدرسے کی تاسیس میں مولانا قاسمؒ کے دست و بازو رہے اور بنیاد کے بعد بھی مدرسے کی مجلس کے رکن کی حیثیت سے مدرسے کے تمام امور میں عملاً شریک رہے۔

یہ محض ایک چھوٹی سی مسجد میں ایک چھوٹا سا مکتب قائم کرنے کا خیال نہ تھا۔ ایسے مدرسے اور مکتب تو ہندوستان میں لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ سن ستاون میں سلطنت مغلیہ کے سقوط کے ساتھ ہی مسلمانان ہند شکست و زوال کے ایسے مصائب و ادبار سے دوچار ہوگئے کہ بقول مولانا قاری محمد طیب "ان حالات سے یقین ہو چلا تھا کہ اسلام کا چمن اب اجڑا اور یہ کہ اب ہندوستان بھی سپین کی تاریخ دہرانے کے لئے کمربستہ ہو چکا ہے کہ اچانک چند نفوس قدسیہ نے بالہام خداوندی اپنے دل میں ایک خلش اور کسک محسوس کی۔ یہ خلش علوم نبوت کے تحفظ' دین کو بچانے اور اس کے راستے سے ستم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کی تھی۔ وقت کے یہ اولیاء اللہ ایک جگہ جمع ہوئے اور اس بارے میں اپنی اپنی قلبی واردات کا تذکرہ کیا جو اس پر مجتمع تھیں کہ اس وقت بقائے دین کی صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ دینی تعلیم کے ذریعے مسلمانان ہند کی حفاظت کی جائے اور تعلیم و تربیت کے راستے سے ان کے دل و دماغ کی تعمیر کرکے ان کی بقاء کا سامان کیا جائے اور اس کی واحد صورت یہی ہے کہ ایک درس گاہ قائم کی جائے جس میں علوم نبویہ پڑھائے جائیں اور ان ہی کے مطابق مسلمانوں کی دینی' معاشرتی اور تمدنی زندگی اسلامی سانچوں میں ڈھالی جائے جس سے ایک طرف تو مسلمانوں کی داخلی رہنمائی ہو اور دوسری طرف خارجی مدافعت۔ نیز مسلمانوں میں صحیح اسلامی تعلیمات بھی پھیلیں اور ایماندارانہ سیاسی شعور بھی بیدار ہو۔ ان مقاصد کے لئے کمر باندھ کر اٹھنے والے یہ لوگ رسمی قسم کے رہنما اور لیڈر نہ تھے بلکہ خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاء وقت تھے اور ان کی یہ باہمی گفت و شنید کوئی رسمی قسم کا مشورہ یا تبادلۂ خیال نہ تھا بلکہ تبادلۂ الہامات تھا"۔

مدرسے کی معنوی بنیاد کے لئے بانی مدرسہ مولانا قاسم نانوتوی نے اپنے ہاتھ سے آٹھ اصول تحریر فرمائے۔ آخری تین اصول جن کا تعلق مدرسے کے مالی امور اور چندہ گیری سے ہے یہ ہیں' جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدرسے کی اقتصاد کی بنیاد فقر و درویشی پر تھی نہ کہ آج کل کے دینی مدارس کی طرح ثروت و کثرت پر۔

چھٹا اصول: اس مدرسے میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں' جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا

سید قاسم محمود

کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ' تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے' ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی رہے۔

ساتواں اصول: سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

آٹھواں اصول: تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے' جن کو اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

اس درس گاہ کے سب سے پہلے مدرس ملا محمود دیوبندی اور سب سے پہلے طالب علم محمود الحسن (جو بعد میں شیخ الہندؒ مشہور ہوئے) سب سے پہلے سرپرست مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سب سے پہلے صدر المدرسین مولانا محمد یعقوب نانوتوی تھے۔ مولانا یعقوب خود ایک جامع العلوم بزرگ تھے۔ ان کے والد مولانا مملوک علی' سرسید احمد خان' مولانا محمد قاسم نانوتوی' مولانا رشید احمد گنگوہی' مولانا محمود الحسن کے والد مولانا ذوالفقار علی اور دوسرے کئی علماء کے استاد تھے اور اس وجہ سے ان کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا۔ وہ خود ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر کے معزز عہدے پر مامور تھے اور جدید (انگریزی) سررشتۂ تعلیم کے نظم و نسق اور طریق کار سے بخوبی واقف تھے۔ جس سال مدرسے کا آغاز ہوا' اسی سال انہوں نے اپنی اعلیٰ ملازمت اور معقول مشاہرے کو قربان کر کے اسلامی علوم کی خدمت کے لئے مدرسہ دیوبند میں پچیس ماہوار کی مدرسی قبول کرلی۔ وہ دارالعلوم کے پہلے صدر مدرس تھے اور مولانا محمد قاسم کی وفات کے بعد جب مولانا رشید احمد گنگوہ میں رہتے تھے تو اس زمانے میں سرپرستی کا بیشتر کام بھی انہی نے کیا۔

پہلے سال ہی کے اختتام پر اس درس گاہ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور طلبہ کی تعداد ۷۸ تک پہنچ گئی' جن میں بنارس' پنجاب اور افغانستان کے ۵۸ طلبہ بھی شامل تھے۔

جب طلبہ کی کثرت ہوئی تو مسجد قاضی کے قریب ایک مکان کرائے پر لیا گیا۔ پھر جب ضروریات مزید بڑھیں تو مدرسہ مسجد قاضی سے اپنی موجودہ نئی عمارت میں منتقل ہوگیا' جس کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی محدث سہارن پوری نے اپنے ہاتھ سے ۱۲۹۳ھ/ ۱۸۷۶ء میں رکھا۔ یہ عمارت بھی وقت کے ساتھ ساتھ بہت ترقی کرتی گئی۔ آج دارالعلوم کے احاطے میں متعدد عمارتیں کھڑی ہیں۔ دوسو میں بڑی بڑی درس گاہیں ہیں' آٹھ ہوسٹل ہیں' تقریباً چار سو حجرے ہیں۔

سلطنت مغلیہ کے خاتمے اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد مسلمانان ہند کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ایک طرف سے سرسید اور ان کی علی گڑھ تحریک نے سنبھالا دیا اور دوسری طرف دارالعلوم دیوبند نے۔ گویا دنیاوی تقاضے سرسید نے پورے کئے اور دینی تقاضے دیوبند نے۔ دینی تقاضے پورے کرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند کے بانیوں کے پیش نظر اہم مقاصد یہ تھے:

(۱) آزادیٔ ضمیر اور اعلائے کلمۃ الحق
(۲) مسلمانوں کو ایک جمہوری عوامی تنظیم میں پرونے کی جدوجہد کرنا
(۳) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مسلک کی حفاظت و اشاعت
(۴) مسلم معاشرے سے خود غرضی اور استبداد کا خاتمہ
(۵) دینی علوم کا احیاء
(۶) علوم عقلیہ کی صحیح تربیت
(۷) دین میں مہارت کے ساتھ ساتھ دنیاوی علوم کے تقاضے پورے کرنے والے علما تیار کرنا

صاحب "موج کوثر" جناب شیخ محمد اکرام رقم طراز ہیں: "دیوبند کا مدرسہ حقیقتاً شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے درس کی نمایاں خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں فرنگی محل

کی طرح منطق اور صرف ونحو اور فقہ ہی پر سارا وقت صرف نہیں ہوتا بلکہ حدیث کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے' جو شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں کی خصوصیت تھی۔ اس خاندان سے شاہ عبدالغنی نے فیض حاصل کیا تھا اور ان سے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے۔ اسی طرح حاجی امداد اللہ مکی مولانا سید احمد بریلویؒ کے ایک خلیفہ کے مرید تھے اور مولانا سید احمد بریلوی شاہ عبدالعزیز کے نامور خلیفہ تھے۔ اس طرح دیوبند میں شروع ہی سے شاہ عبدالعزیز اور ان کے تلامذہ کے درس کی خصوصیت تھیں۔ مسلک ولی اللہی سے فیض یاب ہونے کے علاوہ مدرسے کے منتظمین درس و تدریس کے جدید طریقوں اور نئے تعلیمی انتظامات سے بھی ناواقف نہ تھے۔ مولانا محمد احمد گنگوہی کے استاد مولانا مملوک علی' جو سرسید کے بھی استاد تھے' دہلی کالج میں پروفیسر تھے اور ان بزرگوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب ایک عرصے تک سرکاری محکمۂ تعلیم میں معزز عہدوں پر مامور رہے تھے' اور مولانا محمود الحسن کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی سرکاری مدارس کے انسپکٹر تھے۔ دیوبند نے ندوہ کی طرح اصلاح نصاب کے بلند بانگ دعوے تو نہیں کئے ' لیکن کئی امور میں اصلاحیں کیں۔ نصاب تعلیم میں مذہبی علوم کے علاوہ تاریخ' ہندسہ اور طب کا بھی انتظام ہے۔ ابتدائی درجوں میں اردو اور فارسی کی تعلیم بھی ضروری ہے۔

دارالعلوم کے اعلیٰ عہدے چار ہیں: سرپرست' مہتمم' صدر مدرس اور مفتی۔ پہلے سرپرست مولانا محمد قاسم نانوتوی کا انتقال ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو ہوا۔ یہ دارالعلوم کے لئے ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ تاہم دوسرے سرپرست مولانا رشید احمد گنگوہی کے عہد تک دارالعلوم کی پہلی شان میں کوئی فرق نہ آنے پایا۔ اس اثناء میں مولانا محمود الحسن دیوبند کے حقیقی مقاصد کی آغوش میں تربیت کاملہ پا چکے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں مولانا گنگوہیؒ نے وفات پائی تو مولانا محمود الحسن نے دارالعلوم کو اس کی حقیقی شان کے ساتھ قائم رکھا۔ پھر مولانا اشرف علی تھانوی سرپرست ہوئے۔ صدر مدرس پہلے مولانا محمد یعقوب تھے۔ ان کے بعد مولانا گنگوہی' مولانا محمود الحسن اور مولانا انور شاہ صاحب نے دارالعلوم کو رونق بخشی۔ پھر مولانا حسین احمد مدنی صدر مدرس بنے۔ مہتمم اور مفتی بھی دارالعلوم کو قابل اور فرض شناس ملے۔ بالخصوص مولانا محمد احمد صاحب خلف الرشید مولانا محمد قاسم' اور بعد میں بانی مدرسہ کے پوتے قاری محمد طیب مرحوم کی اہتمام میں دارالعلوم کی ظاہری حیثیت نے بڑی ترقی کی۔ دارالافتاء کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ ہر سال تقریباً آٹھ ہزار استفتاء دارالعلوم میں آتے ہیں۔

ڈاکٹر پروفیسر ظہور احمد اظہر لکھتے ہیں: دارالعلوم میں ان تین مختلف النوع دینی اداروں کی خصوصیات جمع ہیں جو تیرہویں صدی ہجری یعنی انیسویں صدی عیسوی کے دوران میں دہلی' لکھنو اور خیرآباد میں موجود تھے۔ دہلی کے ادارے تفسیر اور حدیث کی تعلیم پر زور دیتے تھے' لکھنو کے فقہ پر جبکہ خیرآباد علم الکلام اور فلسفے کے لئے مخصوص تھا۔ دیوبند ان تینوں کے امتزاج کی نمائندگی کر رہا ہے' گو اس کا اصل زور احادیث پر ہے' جنہیں شاہ ولی اللہ اور دہلی کے کتب محدثین کے نزدیک درجۂ استناد حاصل ہے۔ دیوبند میں بلاد اسلامیہ کے مختلف حصوں سے بھی طلبہ آتے رہتے ہیں۔ اس میں تقریباً پندرہ سو طلبہ کے قیام کا بندوبست ہے۔ دیوبند کے کتاب خانے کا شمار ہندوستان میں مخطوطات کے بڑے بڑے کتاب خانوں میں ہوتا ہے' تاہم اس کی فہرست کتب موجود نہیں۔ اس میں تقریباً ستر ہزار عربی' فارسی اور اردو کی کتابیں موجود ہیں' جو مطبوعہ بھی ہیں اور قلمی بھی۔ تعلیم کا طریقہ روایتی ہے۔ اس کا زور زیادہ تر اس بات پر ہے کہ دین دار شخصیتیں پیدا کی جائیں' اس پر نہیں کہ جدید علوم سے بہرہ ور ہو کر عہد حاضر کے تقاضے پورے کر سکیں' لہٰذا اس ادارے نے زیادہ تر دینی رہنما پیدا کئے ہیں۔ گو سیاسی میدان میں بھی اس کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔''

دیوبند کے نصاب کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے جناب شیخ محمد اکرام نے یہ رائے لکھی ہے: ''دیوبند کا نصاب ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ناکافی سہی اور علمائے دیوبند کو حالات زمانہ اور مغربی مستشرقین یا دور حاضر کے مصری علماء کی تصانیف سے اتنی واقفیت نہ سہی جتنی بعض علمائے ندوۃ العلما کو ہے' لیکن دیوبند کا پیمانہ بہت وسیع ہے۔ وہاں سے ہزاروں علما اور طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں' جنہوں نے ملک کے کونے کونے میں اسلامی علوم کے چراغ روشن کئے۔ مذہب کی اشاعت کی' بدعتوں اور مضر اخلاق خرابیوں کی اصلاح کی۔ یہ درست ہے کہ وہ جدید ضروریات کے لحاظ سے کئی باتوں میں باخبر نہیں' لیکن آخر ان میں تقویٰ' پرہیزگاری اور روحانیت دوسروں سے زیادہ ہے۔ علامہ سید رشید رضا صاحب ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسے کی تقریب پر ۱۹۱۲ء میں ہندوستان آئے تھے تو آپ دیوبند بھی تشریف لے گئے اور اس دارالعلوم کے متعلق آپ نے فرمایا کہ اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہو کر واپس آ جاتا۔ اس دارالعلوم نے مجھ کو بتا دیا ہے کہ ہندوستان میں ابھی علوم عربیہ اور تعلیمات مذہبی اعلیٰ پیمانے پر ہیں۔''

دیوبندی علمائے کرام کا مسلک شاہ ولی اللہی مسلک ہے۔ مولانا قاسم نانوتوی تین واسطوں سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے شاگرد تھے۔ یہ حضرات فقہی مذاہب میں سے امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں اور تقلید کو بھی بالعموم ضروری سمجھتے ہیں۔ قرآن و سنت پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے علاوہ ان کا تصوف سے بھی گہرا تعلق ہے۔ ردبدعت میں یہ بھی پیش پیش ہیں البتہ غلو سے پرہیز کرتے ہیں۔ اکثر علماء دیوبند روحانی مسلک کے لحاظ سے حاجی امداد اللہ مکی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں جو تصوف کے چاروں سلسلوں یعنی نقشبندی' چشتی' قادری اور سہروردی سے منسلک تھے۔ تاہم تصوف کو دنیاداری سے قطعاً دور رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ عقائد اور علم الکلام میں امام ابوالحسن اشعری کے مقلد ہیں۔ رسول کریمؐ کی محبت و عظمت پر ایمان رکھتے ہیں۔ کثرت درود کو عین ثواب اور صدق نیت اور صحیح روایت کے مطابق ولادت نبویؐ کے تذکرے کو بھی پسند کرتے ہیں۔ وہ غالی بریلوی مسلک اور غالی اہل حدیث مسلک کے بین بین رہتے ہیں۔ علامہ شبیر احمد عثمانی ایک موقع پر لکھتے ہیں: ''ہماری حالت تو یہ ہے کہ نہ ہم غیر مقلدین کو کافر کہتے ہیں' نہ تمام شیعوں کو نہ سارے نیچریوں کو''۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ایک موقع پر کہا: ''فی زمانہ کفار کا غلبہ ہے۔ یہ وقت نہیں ہے کہ مسلمانوں میں تفریق کو ہوا دی جائے' جس سے ان کا کلمہ متفرق ہو کر مزید ضعف پیدا ہو' بلکہ توڑنے کے بجائے جوڑنے کی فکر کی جائے۔'' علمائے دیوبند کے اس مسلک نے انہیں سب کی نظر میں محترم بنا دیا۔ چنانچہ پیر مہر علی شاہ گولڑوی نے ایک جگہ فرمایا: ''مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا زمانہ میں نے نہیں پایا۔ مولانا خلیل احمد سہارن پوری اور مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کی زیارت ایک دفعہ کی ہے' مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا۔ مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کی ایک دفعہ زیارت کی ہے اور ایک دفعہ وعظ بھی سنا ہے۔ اس سے زیادہ ان حضرات کے ساتھ مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا' مگر میرا اعتقاد ان بزرگوں کے متعلق یہ ہے کہ یہ سب حضرات علمائے ربانین اور اولیائے امت محمدیہ میں سے تھے۔ احقر کو بعض مسائل میں ان سے اختلاف بھی ہے' مگر میرا اعتقاد یہی ہے اور اس اعتقاد کے اختیار کرنے کا سبب ان کی تصنیفات کا مطالعہ اور قبول عام ہے...''

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اپنی تصنیف ''برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ'' میں رقم طراز ہیں: ''دیوبند کا دارالعلوم جو اس وقت کی اختلافی بحثوں سے الگ تھلگ رہا' اپنی تمام تر قدامت پسندی کے باوجود عملی مطمع نظر رکھتا تھا اور اس نے اپنے کام سے کام رکھا۔ اس نے علی گڑھ پر سنگ باری نہیں کی' اگرچہ وہ سید احمد خان کی آراء اور ان کے افعال سے متفق نہیں ہو سکتا تھا۔ دیوبند میں علما کا ایک گروہ ایسا تھا جو اتحاد اسلامی کا شبلی یا ابوالکلام سے کم پرجوش حامی نہیں تھا' مگر اس گروہ نے اس خیال کو مقبول بنانے کے لئے تبلیغ و اشاعت

کی مہم جاری نہیں کی۔ وہ موقعے کا منتظر رہا اور اس نے تج کے ادارے کے ذریعے باب عالی سے روابط پیدا کرنے کی کوشش کی۔''

دیوبندی علمائے کرام نے تحریک آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نزدیک دارالعلوم کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد ملت اسلامیہ کو جہاد آزادی اور ہندوستان سے انگریز کو نکالنے کے لئے تیار کیا جائے۔ آزادیٔ ہند کے لئے ریشمی رومال کی تحریک شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی ہی نے منظم کی تھی۔ تحریک خلافت اور ترک موالات کی تحریک میں بھی ان علماء نے بڑا حصہ لیا۔ ''قرارداد پاکستان'' کی منظوری کے بعد اس جماعت کے دو حصے ہوگئے۔ ایک انگریزوں کی مخالفت کے جوش میں اتنا بڑھ گیا کہ نیشنل کانگریس کا پرجوش حامی ہوگیا۔ اس کے برعکس مولانا اشرف علی تھانوی' علامہ شبیر احمد عثمانی' مفتی محمد شفیع اور مولانا احتشام الحق تھانوی وغیرھم نے مسلم لیگ کے موقف کی تائید کی اور تحریک پاکستان میں عملاً حصہ لیا۔ چنانچہ زیادہ تر انہی کی وجہ سے مشرقی بنگال میں سلہٹ اور شمال مغربی صوبہ سرحد میں ہونے والے ریفرنڈم میں مسلم لیگ کو کامیابی نصیب ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند کی ترقی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ''اس کا بیج اچھا تھا اور اچھے ہاتھوں سے بویا گیا تھا۔'' دیوبند کو مشہور و نامور اور فاضل علماء کی ایک صالح اور مضبوط جماعت حاصل رہی ہے۔ چند اسماء گرامی یہ ہیں: مولانا محمد قاسم نانوتوی' مولانا خورشید احمد گنگوہی' مولانا محمود حسن' مولانا عبداللہ انبیٹھوی' مولانا سید احمد حسن امروہوی' حکیم جمیل الدین نگینوی' مولانا عبدالعلی دہلوی' مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی' مولانا اشرف علی تھانوی' مولانا حافظ عبدالرحمٰن امروہوی' مولانا حکیم عبدالوہاب المعروف بہ حکیم نابینا' مولانا نجم الدین' علامہ انور شاہ کشمیری' مولانا مفتی کفایت اللہ' مولانا حسین احمد مدنی' مولانا عبید اللہ سندھی' مولانا عبدالرزاق پشاوری' مولانا محمد میاں منصور انصاری' مولانا شبیر احمد عثمانی' مولانا سید فخر الدین احمد' مولانا ثناء اللہ امرتسری' مولانا مناظر احسن گیلانی' مولانا مفتی محمد شفیع' قاری مولانا محمد طیب' مولانا محمد اعزاز علی' مولانا محمد ادریس کاندھلوی' مولانا غلام غوث ہزاروی' مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھی' مولانا مفتی عتیق الرحمٰن' مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی' مولانا سید محمد میاں' مولانا سعید احمد اکبر آبادی' مولانا محمد یوسف بنوری' مولانا حامد الانصاری' مولانا مفتی محمد محمود' مولانا تاجور نجیب آبادی' مولانا مظہر الدین بجنوری' مولانا شائق احمد عثمانی' مولانا ظفر احمد عثمانی وغیرہم۔

قیام پاکستان کے بعد علمائے دیوبند کا علمی و روحانی مرکز ہندوستان میں رہ گیا۔ دارالعلوم دیوبند سے قلبی و روحانی وابستگی کے باعث پاکستان کے مختلف مقامات پر علمی و دینی مراکز قائم کئے گئے۔ بھارت میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور اور مدرسہ قاسم العلوم مراد آباد فکری نقطۂ نظر سے دارالعلوم دیوبند سے مربوط ہیں۔ اسی طرح انبیٹھ (ضلع سہارن پور) تھانہ بھون (ضلع مظفر نگر) اور گلاوٹھی (ضلع بلند شہر) میں اس کی ملحقہ شاخیں موجود ہیں۔ پاکستان میں جامعہ اشرفیہ لاہور' جامعہ مدنیہ لاہور' مدرسہ قاسم العلوم ملتان' دارالعلوم ٹنڈو الہ یار خان' دارالعلوم کراچی' دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک دیوبندی مکتب فکر کی علمی یادگاروں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

ماخذ

☆ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ: ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
☆ تیس بڑے مسلمان: جناب عبدالرشید ارشد
☆ مقالہ بعنوان ''دیوبندی'' از ڈاکٹر ظہور احمد اظہر (اردو دائرہ معارف اسلامیہ)
☆ موج کوثر: شیخ محمد اکرام
☆ مشاہیر علماء دیوبند: حافظ قاری فیوض الرحمٰن
☆ تعمیر پاکستان اور علماء ربانی: منشی عبدالرحمٰن

خبرنامہ اسلامی امارت افغانستان ضربِ مومن' ۳۰ مارچ تا ۵ اپریل ۲۰۰۱ء

بُت شکنی کی برکات: افغانستان میں خشک سالی کا خاتمہ' موسلا دھار بارش

افغانستان میں طویل خشک سالی کے بعد گزشتہ دو ہفتوں سے بارشوں کا سلسلہ جاری ہے اور اب افغانستان کا کوئی علاقہ ایسا نہیں ہے جہاں خوب بارشیں نہ ہوئی ہوں۔ اس سلسلہ میں افغانستان کے مختلف علاقوں مزار' غلان' قندوز' نیمروز' تخار' فراہ' کابل' غزنی' قندھار' زابل' لوگر' ہلمند' وردگ' ہرات اور بادغیس سے ملنے والی اطلاعات میں بتایا گیا ہے کہ طویل خشک سالی کے بعد مرجھائے ہوئے قحط زدہ لوگوں کے چہروں پر بہار آگئی ہے۔ افغان عوام باران رحمت پر ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے ہیں اور بہت خوش ہیں۔ حضرت امیرالمؤمنین ملا محمد عمر مجاہد نے افغانستان میں بتوں اور مجسموں کے توڑے جانے پر تاخیر کے افسوس کا اظہار کیا تو لوگوں نے اچنبھا محسوس کیا لیکن بتوں کے انہدام کے ساتھ ہی ہونے والی مسلسل باران رحمت سے لوگوں پر حضرت امیرالمؤمنین کی دینی بصیرت مزید واضح ہوگئی ہے اور ان کی حضرت امیرالمؤمنین کے ساتھ عقیدت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ عوام کا خیال ہے کہ حضرت امیرالمؤمنین کی ایمانی جرأت نے آسمانوں سے باران رحمت کو اتار لیا اور بت شکنی کی برکات سے بالآخر افغانستان میں خشک سالی کا خاتمہ ہوگیا اور پورے افغانستان میں موسلا دھار بارشیں ہوئی ہیں یہاں تک کہ صحرا بھی جل تھل ہوگئے ہیں۔

Better Education, Proper Training & Moral uplift
All...Under the golden perspective of
ISLAMIC Teachings..........

- Focus on Islam
- High Educational Standards
- Healthy Atmosphere
- Proper Training
- Reasonably Affordable
- Easy Approach

ADMISSION OPEN

Boys: **Nursery to Class VI**
Girls: **Nursery to Matric/O-level**

HIRA SCHOOL (Regd.)
284-N, Model Town Extension, Lahore Ph: 042 5162108
E-mail: hiraschl@hotmail.com . hafiz@brain.net.pk

✪ چودھویں صدی ہجری کے بارے میں راقم کا یہ گمان رفتہ رفتہ یقین کے درجے کو پہنچ گیا کہ اس کے مجددِ اعظم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی ہیں

✪ ابوالکلام کی تعریف و تحسین' حضرت شیخ الہندؒ نے ان الفاظ میں فرمائی کہ "اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد کرادیا"

✪ حضرت شیخ الہندؒ کے ایک معتمد علیہ رفیق اور شاگرد علامہ شبیر عثمانیؒ اور ان کے رفقاء نے پاکستان کے قیام کے ضمن میں نہایت عظیم اور فیصلہ کن خدمات سرانجام دیں

✪ راقم کا گمانِ غالب ہے کہ اس کی قرآنی تحریک کو بلاشائبہ ریب وشک مولانا عبدالحئی فاروقیؒ اور مولانا احمد علی لاہوریؒ سے "نسبت اویسیؒ" حاصل ہے

✪ مولانا مودودی مرحوم اور جماعت اسلامی کی پالیسیوں کے تضادات کی داستان بہت طویل ہے

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی تالیف

"جماعتِ شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی"

کا مقدّمہ —— چند اقتباسات

❁ راقم کے نزدیک اسلام کے "ہمہ جہتی احیائی عمل" کے تین نمایاں' منفرد اور ممتاز گوشے ہیں:

❁ ایک: خالص قومی و ملی تحریکیں' جن کا اصل موضوع ہے جہاد حریت و استخلاصِ دیارِ مسلمین' یعنی مسلم ممالک کی سیاسی غلامی کا خاتمہ اور آزادی کا حصول۔

❁ دوسرے: علماء کرام کی مساعی جن کا اصل ہدف ہے تصحیح عقائد و اعمال' تعلیم کتاب و سنت' حفاظت دین و شریعت۔ اور باطل فرقوں کا ابطال اور جدید فتنوں کا استیصال۔

❁ تیسرے: مثبت احیائی و تجدیدی مساعی جن کا معین مقصود ہے اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق' یا بالفاظ دیگر اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت کا قیام!

❁ اور یہ تینوں گوشے مل جل کر' اور یہ جملہ مساعی بحیثیت مجموعی تسلسل ہیں امت محمد ﷺ کی تاریخ کے "الف ثانی" (یعنی دوسرے ہزار سال) کی تجدیدی مساعی کے سنہری سلسلے کا!

❁ راقم کے نزدیک برعظیم پاک و ہند کی بیسویں صدی عیسوی کی مسلمان تحریکوں میں سے "تحریک پاکستان" گوشہء اول سے تعلق رکھتی ہے' جبکہ علماء کرام کی جملہ جمعیتیں' اور ادارے اور بالخصوص تبلیغی جماعت کا تعلق دوسرے گوشے سے ہے' جبکہ تیسرے سلسلے کے داعیٔ اول کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کو حاصل ہے۔

❁ الف ثانی کے تجدیدی کارنامے کا نقطۂ آغاز اور گیارہویں صدی ہجری کے مجدد اعظم تو بلاشک وشبہ شیخ احمد سرہندیؒ ہیں' لیکن ان کے ہم عصر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی علمی خدمات بھی یقیناً قابل تحسین ہیں۔

❁ اسی طرح بارہویں صدی ہجری کے مجدد اعظم تو بلاشائبہ ریب وشک امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں' لیکن شیخ نجد محمد ابن عبدالوہابؒ کی اصلاحی کوششیں بھی یقیناً قابل تعریف ہیں۔

❁ اسی طرح تیرہویں صدی ہجری کے اصل مجدد تو مجاہد کبیر سید احمد بریلویؒ ہیں' تاہم ان کے نائب و معاون شاہ اسماعیل شہیدؒ بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک اور سہیم ہیں!

❁ چودھویں صدی ہجری کے بارے میں راقم کا یہ گمان رفتہ رفتہ یقین کے درجے تک پہنچ گیا ہے کہ اس کے مجدد اعظم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ہیں (اگرچہ بعض دوسرے اصحاب دعوت وعزیمت کے علاوہ

ایک عؔ 'برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است'' کی سچی تصویر اور عؔ ''اگر چہ سر نہ تراشد قلندری داند'' کا مصداق اتم اور داڑھی منڈا عاشق احمد مرسلؐ و پروانۂ احمد سرہندیؒ یعنی علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی مساعی بھی حد درجہ دور رس اور از بس نتیجہ خیز ہیں!)

❁ عجیب بات ہے کہ اپنے انتقال کے قریب حضرت شیخ الہندؒ نے ''خرقہ خلافت'' عطا فرما دیا ایک ایسے شخص کو جو نہ صرف یہ کہ نہ ان کے تلامذہ میں سے تھا' نہ حلقہ دیو بند سے تعلق رکھتا تھا' بلکہ علماء کے دیگر معروف حلقوں اور سلسلوں میں سے بھی کسی سے منسلک نہ تھا۔

❁ حتی کہ علماء کی سی وضع قطع بھی نہ رکھتا تھا بلکہ بقول خود ''گلیم زہد اور ردائے رندی'' دونوں کو بیک وقت زیب تن کرنے کے ''جرم'' کا مرتکب تھا۔

اور عجیب اتفاق ہے کہ اس کا نام بھی احمد ہی تھا' اگر چہ وہ مشہور یا اپنی کنیت سے ہوا یا تخلص سے' یعنی ''ابوالکلام آزاد''

> **عجیب بات ہے کہ اپنے انتقال کے وقت حضرت شیخ الہند نے ''خرقہ خلافت'' ایک ایسے شخص کو عطا فرما دیا جو ان کے تلامذہ میں سے تھا نہ حلقہ دیو بند سے تعلق رکھتا تھا۔**

❁ یہ ہمارے ماضی قریب کی تاریخ کا نہایت اہم واقعہ ہے جس پر معاصرانہ چشمک نے انتہائی دبیز پردہ ڈال دیا ہے!

لیکن ۔

''سرخدا کہ عارف و سالک بہ کس نہ گفت
درحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید!''

کے مصداق اس ''راز'' کی بھنک پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی زبانی راقم الحروف کے کان میں پڑ گئی۔

❁ اگر چہ ان کی بیان کردہ روایت میں زمانی و مکانی ہر نوع کے سقم تھے۔

❁ تاہم یہی سقم تحقیق و تفتیش کا سبب بن گئے۔

❁ اور اس طرح مسلم انڈیا کی ماضی قریب کی تاریخ کا ایک اہم لیکن گم شدہ باب روشنی میں آ گیا۔

❁ اور اس تحقیق و تفتیش کے اضافی ثمرے کے طور پر راقم الحروف پر حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت بہ تمام و کمال منکشف ہو گئی۔

❁ فللہ الحمد!

❁ بہر حال اب اس بات کے سامنے آ جانے کے بعد ہر اُس شخص پر جو حضرت شیخ الہندؒ سے کسی بھی درجہ میں قلبی تعلق یا نسبت عقیدت رکھتا ہو لازم ہے کہ وہ:

❁ ......اولاً اس واقعہ کی اپنے طور پر مزید تحقیق کرے ۔ اور اگر اسے درست پائے تو

....پھر: غور کرے کہ اس کے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں؟ انشاء اللہ العزیز اس سے اس کے فکر و نظر کو جلا اور قلب و ذہن کو وسعت حاصل ہو گی اور امت مسلمہ بالخصوص مسلمانان برعظیم پاک و ہند کے موجودہ ظروف و احوال اور ان کے تاریخی پس منظر کے بارے میں گہری بصیرت حاصل ہو جائے گی۔

❁ مولانا ابوالکلام آزاد کا سن پیدائش ۱۸۸۸ء ہے۔

❁ ۱۹۱۲ء میں چوبیس برس کی عمر میں انہوں نے ''الہلال'' جاری کیا۔

❁ ''الہلال'' کے مضامین کا نقطہ ماسکہ' جسے اس کی علامت و عنوان قرار دیا جا سکتا ہے۔

❁ دعوت رجوع الی القرآن تھا!

❁ اس کی دعوت کا دوسرا اہم نکتہ تھا جہاد و قتال فی سبیل اللہ....اور اس کی تمہید کے طور پر ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر!

❁ ابوالکلام کی اس دعوت کی توثیق و تصویب اور تعریف و تحسین حضرت شیخ الہندؒ نے ان الفاظ کے ذریعے فرمائی کہ ''اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے! (راقم الحروف کو حضرت شیخ الہندؒ کے اس مشہور قول کی سند مولانا یوسف بنوریؒ سے بالمشافہ حاصل ہو گئی تھی!)

❁ ۱۹۱۳ء میں مولانا آزاد نے ایک جانب قرآن کے مبلغ و معلم تیار کرنے کے لئے کلکتہ میں ''دارالارشاد'' قائم کیا اور دوسری جانب اقامت دین اور اعلاء کلمتہ اللہ کے لئے حزب اللہ قائم کی جس کی اساس ''بیعت'' پر استوار کی!

❁ ۱۹۱۵ء میں انہوں نے خود (گویا اپنے جملہ مبایعین سمیت) حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت کر لی!

❁ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم کے قول کے مطابق اسی سال حضرت شیخ الہندؒ نے ان کے بارے میں اپنے جذبات اس شعر کے ذریعے ظاہر فرمائے کہ ۔

کامل اس طبقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے!

❁ مولانا موصوف پیدائشی طور پر حد درجہ ذہین و فطین بلکہ نابغۂ عصر تو تھے ہی'

❁ اس پر مستزاد انہیں متعدد مسلمان ممالک کے حالات کا بچشم سر مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا۔

❁ مزید برآں انہوں نے مغربی فکر و فلسفہ' اور خاص طور پر سیاسیات و عمرانیات جدیدہ کا بھی مطالعہ کیا تھا۔

❁ چنانچہ انہیں خوب معلوم تھا کہ:

❁ .....فی الوقت برعظیم پاک و ہند میں کسی عسکری تحریک کا کوئی امکان نہیں!

❁ .... کسی دوسرے مسلمان ملک سے مدد کا بھی کوئی سوال نہیں' گویا اب کوئی احمد شاہ ابدالی مسلمانان ہند کی مدد کے لئے نہیں آ سکتا!

❁ بلکہ اب ''استخلاصِ وطن'' کی جدوجہد ہو یا غلبۂ اسلام اور اقامت دین کی سعی' تمام کام خالص مقامی لیکن عوامی تحریکوں کے ذریعے ہی ہو سکیں گے۔

❁ لہذا ان کا مشورہ یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ ہندوستان ہی میں رہ کر عوامی تحریک برپا کریں۔

❁ لیکن افسوس کہ اس وقت حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ان مشیروں کی رائے پر عمل کیا جو دینی علم میں تو بہت دسترس رکھتے تھے لیکن ان کا ہاتھ حالات جدیدہ کی نبض پر نہ تھا!

اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

❁ ادھر بیرون ہند نام نہاد مسلمان امراء و سلاطین نے غداری کی اور ایک طرف شریف حسین والی مکہ نے حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے گویا چاندی کی طشتری میں سجا کر انگریزوں کے سامنے پیش کر دیا جنہوں نے انہیں ہندوستان کی کسی جیل میں نہیں بلکہ مالٹا میں نظر بند کیا!

....(راقم کے نزدیک علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر بہ تمام و کمال صادق آتا ہے حضرت شیخ الہندؒ کی مالٹا کی اسیری پر کہ ۔

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو!)

❁ یہی سلوک افغانستان میں امیر کابل کے ہاتھوں حضرت شیخ الہندؒ کے سفیر اور معتمد خصوصی مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے ساتھ ہونے والا تھا کہ انہیں بروقت اطلاع مل گئی اور وہ روس کی جانب فرار ہو گئے!

❁ ادھر اندرون ملک ریشمی رومال کے راز کے افشاء پر علماء کرام اور خادمان دین متین نے تو عؔ ''من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را!'' کے مصداق پکڑ دھکڑ' قید و بند

ایک ع 'برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است'' کی سچی تصویر اور ع ''اگر چہ سر نہ تراشد قلندری داند'' کا مصداق اتم اور داڑھی منڈا عاشق احمد مرسلؐ و پروانۂ احمد سر ہندیؒ یعنی علامہ اقبال مرحوم و مغفور کی مساعی بھی حد درجہ دُور رس اور از بس نتیجہ خیز ہیں!)

❀ عجیب بات ہے کہ اپنے انتقال کے قریب حضرت شیخ الہندؒ نے ''خرقۂ خلافت'' عطا فرمادیا ایک ایسے شخص کو جو نہ صرف یہ کہ نہ ان کے تلامذہ میں سے تھا' نہ حلقۂ دیوبند سے تعلق رکھتا تھا' بلکہ علماء کے دیگر معروف حلقوں اور سلسلوں میں سے بھی کسی سے منسلک نہ تھا۔

❀ حتیٰ کہ علماء کی سی وضع قطع بھی نہ رکھتا تھا بلکہ بقول خود ''گلیم زہد اور ردائے رندی'' دونوں کو بیک وقت زیب تن کرنے کے ''جرم'' کا مرتکب تھا۔

اور عجیب اتفاق ہے کہ اس کا نام بھی احمد ہی تھا' اگر چہ وہ مشہور ہوا اپنی کنیت سے ہوا یا تخلص سے' یعنی ''ابوالکلام آزاد''

❀ یہ ہمارے ماضی قریب کی تاریخ کا نہایت اہم واقعہ ہے جس پر معاصرانہ چشمک نے انتہائی دبیز پردہ ڈال دیا ہے!

لیکن۔

''سر خدا کہ عارف و سالک بہ کس نہ گفت
درحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید!''

کے مصداق اس ''راز'' کی بھنک پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی زبانی راقم الحروف کے کان میں پڑ گئی۔

❀ اگر چہ ان کی بیان کردہ روایت میں زمانی و مکانی ہر نوع کے سقم تھے۔

❀ تاہم یہی سقم تحقیق و تفتیش کا سبب بن گئے۔

❀ اور اس طرح مسلم انڈیا کی ماضی قریب کی تاریخ کا ایک اہم لیکن گم شدہ باب روشنی میں آ گیا۔

❀ اور اس تحقیق و تفتیش کے اضافی ثمرے کے طور پر راقم الحروف پر حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت بہ تمام و کمال منکشف ہوگئی۔

❀ فللہ الحمد!

❀ بہر حال اب اس بات کے سامنے آجانے کے بعد ہر اُس شخص پر جو حضرت شیخ الہندؒ سے کسی بھی درجہ میں قلبی تعلق یا نسبت عقیدت رکھتا ہو لازم ہے کہ وہ:

❀ ..... اولاً اس واقعہ کی اپنے طور پر مزید تحقیق کرے

۔ اور اگر اسے درست پائے تو

..... پھر: غور کرے کہ اس کے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں؟

انشاء اللہ العزیز اس سے اس کے فکر و نظر کو جلا اور قلب و ذہن کو وسعت حاصل ہوگی اور امت مسلمہ بالخصوص مسلمانان برعظیم پاک و ہند کے موجودہ ظروف و احوال اور ان کے تاریخی پس منظر کے بارے میں گہری بصیرت حاصل ہو جائے گی۔

❀ مولانا ابوالکلام آزاد کا سن پیدائش ۱۸۸۸ء ہے۔

❀ ۱۹۱۲ء میں چوبیس برس کی عمر میں انہوں نے ''الہلال'' جاری کیا۔

❀ ''الہلال'' کے مضامین کا نقطہ ماسکہ جسے اس کی علامت و عنوان قرار دیا جا سکتا ہے۔

❀ دعوت رجوع الی القرآن تھا!

عجیب بات ہے کہ اپنے انتقال کے وقت حضرت شیخ الہند نے ''خرقہ خلافت'' ایک ایسے شخص کو عطا فرمادیا جو ان کے تلامذہ میں سے تھا نہ حلقہ دیوبند سے تعلق رکھتا تھا۔

❀ اس کی دعوت کا دوسرا اہم نکتہ تھا جہاد و قتال فی سبیل اللہ.... اور اس کی تمہید کے طور پر ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر!

❀ ابوالکلام کی اس دعوت کی توثیق و تصویب اور تعریف و تحسین حضرت شیخ الہندؒ نے ان الفاظ کے ذریعے فرمائی کہ ''اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے! (راقم الحروف کو حضرت شیخ الہندؒ کے اس مشہور قول کی سند مولانا یوسف بنوریؒ سے بالمشافہ حاصل ہوگئی تھی!)

❀ ۱۹۱۳ء میں مولانا آزاد نے ایک جانب قرآن کے مبلغ و معلم تیار کرنے کے لئے کلکتہ میں ''دارالارشاد'' قائم کیا اور دوسری جانب اقامت دین اور اعلاء کلمتہ اللہ کے لئے حزب اللہ قائم کی جس کی اساس ''بیعت'' پر استوار کی!

❀ ۱۹۱۵ء میں انہوں نے خود (گویا اپنے جملہ مبایعین سمیت) حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت کر لی!

❀ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم کے قول کے مطابق اسی سال حضرت شیخ الہندؒ نے ان کے بارے میں اپنے جذبات اس شعر کے ذریعے ظاہر فرمائے کہ۔

کامل اس طبقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے!

❀ مولانا موصوف پیدائشی طور پر حد درجہ ذہین و فطین بلکہ نابغۂ عصر تو تھے ہی'

❀ اس پر مستزاد انہیں متعدد مسلمان ممالک کے حالات کا بچشم سر مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا۔

❀ مزید برآں انہوں نے مغربی فکر و فلسفہ' اور خاص طور پر سیاسیات و عمرانیات جدیدہ کا بھی مطالعہ کیا تھا۔

❀ چنانچہ انہیں خوب معلوم تھا کہ:

❀ ..... فی الوقت برعظیم پاک و ہند میں کسی عسکری تحریک کا کوئی امکان نہیں!

❀ ..... کسی دوسرے مسلمان ملک سے مدد کا بھی کوئی سوال نہیں' گویا اب کوئی احمد شاہ ابدالی مسلمانان ہند کی مدد کے لئے نہیں آ سکتا!

❀ بلکہ اب ''استخلاصِ وطن'' کی جدوجہد ہو یا غلبۂ اسلام اور اقامت دین کی سعی' تمام کام خالص مقامی لیکن عوامی تحریکوں کے ذریعے ہی ہو سکیں گے۔

❀ لہٰذا ان کا مشورہ یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ ہندوستان ہی میں رہ کر عوامی تحریک برپا کریں۔

❀ لیکن افسوس کہ اس وقت حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ان مشیروں کی رائے پر عمل کیا جو دینی علم میں تو بہت دسترس رکھتے تھے لیکن ان کا ہاتھ حالات جدیدہ کی نبض پر نہ تھا!

اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

❀ ادھر بیرون ہند نام نہاد مسلمان امراء و سلاطین نے غداری کی اور ایک طرف شریف حسین والئ مکہ نے حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے گویا چاندی کی طشتری میں سجا کر انگریزوں کے سامنے پیش کر دیا جنہوں نے انہیں ہندوستان کی کسی جیل میں نہیں بلکہ مالٹا میں نظر بند کیا!

.... (راقم کے نزدیک علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر بہ تمام و کمال صادق آتا ہے حضرت شیخ الہندؒ کی مالٹا کی اسیری پر کہ۔

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو!)

❀ یہی سلوک افغانستان میں امیر کابل کے ہاتھوں حضرت شیخ الہندؒ کے سفیر اور معتمد خصوصی مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے ساتھ ہونے والا تھا کہ انہیں بروقت اطلاع مل گئی اور وہ روس کی جانب فرار ہوگئے!

❀ ادھر اندرون ملک ریشمی رومال کے راز کے افشاء پر علماء کرام اور خادمان دین متین نے توع ''من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را!'' کے مصداق پکڑ دھکڑ' قید و بند

اور تعذیب و ابتلاء کے نئے باب رقم کئے' لیکن چونکہ ملک میں کوئی عوامی تحریک موجود نہ تھی لہٰذا نہ زمین پر کوئی ہل چل برپا ہوئی نہ فضاء میں کوئی ارتعاش پیدا ہوا!

❁ ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہندؒ اسیری سے رہائی پا کر وارد ہند ہوئے تو انہوں نے کامل ضعف و نقاہت اور شدت مرض و علالت کے باوجود چھ ماہ کے مختصر سے عرصے میں تین اہم کام سرانجام دیئے:

❁ ...ایک: اپنے تلامذہ اور مسترشدین کو ہدایت کی کہ وہ اپنی تمام تر توجہات کو خدمت قرآن پر مرکوز کر دیں۔ جس کا مظہر اتم آپ کا خطبۂ دیوبند ہے! (بروایت حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ)

❁ ....دوسرے: قدیم اور جدید تعلیم...اور قومی و ملی اور دینی و مذہبی تحریکوں کے مابین فصل و بعد کو کم کرنے کی کوشش....جس کا سب سے بڑا مظہر آپؒ کا سفر علی گڑھ اور تاسیس جامعہ ملیہ ہے!

❁ تیسرے: علم جہاد بلند کرنے کے لئے ایک عوامی تحریک کے آغاز کے لئے کسی صاحب دعوت و عزیمت اور حامل فہم و بصیرت بالخصوص موجودہ زمانے کے سیاسی و عمرانی ظروف و احوال سے کماحقہ واقف شخص کے ہاتھ پر بیعت کی تجویز اور اس کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کی تعیین!....جس کے ضمن میں حضرت شیخ الہندؒ کے اضطرار و اصرار کا مظہر ان کا یہ قول ہے کہ ''میری چارپائی شیخ پر لے جائی جائے تاکہ میں خود بیعت کرلوں' اس لئے کہ میں دنیا سے بغیر بیعت کئے رخصت ہونا نہیں چاہتا'' (روایت بالمعنی)

❁ تو....اگرچہ اصلاً مشیت خداوندی اور ظاہراً بعض علماء کی جانب سے فوری طور پر اختلاف اور بعدازاں باقاعدہ مخالفت کی بناء پر شیخ الہندؒ کی یہ تجویز ناکام ہوگئی۔

❁ تاہم....یہ ثابت ہوگیا کہ جہاں علم و فضل اور تقویٰ و تدین کے میدان میں حضرت شیخ الہندؒ کی جانشینی کا شرف حاصل ہے مولانا حسین احمد مدنیؒ' مولانا انور شاہ کاشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ وغیرہم کو....وہاں دعوت و تحریک کے میدان میں حضرت شیخ الہندؒ کے اصل خلیفۂ مجاز تھے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور!

❁ جہاں تک مولانا آزاد کی ۲۱-۱۹۲۰ء کے بعد کی زندگی کا تعلق ہے تو اگرچہ وہ اصلاً راقم کا موضوع نہیں ہے۔

❁ تاہم دلائل و شواہد سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ:

❁ علماء کرام کی عمومی مخالفت...جس کا آغاز تو بعض غیر دیوبندی علماء کی جانب سے ہوا تھا لیکن بعدازاں اس میں بہت سے دیوبندی علماء حتیٰ کہ حضرت شیخ الہندؒ کے بعض تلامذہ بھی شامل ہوگئے تھے.....سے بددل ہوکر انہوں نے ''بیعت'' کی ٹھیٹھ شرعی اساس پر ایک خالص دینی تحریک کا خیال دل سے نکال دیا۔

❁ اور اگرچہ اپنی روایتی وضعداری کے تحت انہوں نے جمعیت علماء کے جلسوں میں اکثر و بیشتر خاموش سامع و ناظر کی حیثیت سے شرکت جاری رکھی تاہم اپنے میدان کے اعتبار سے انہوں نے:

❁ اولاً...تحریک خلافت کے ذریعے ایک ملی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

❁ اور اس کے بعد مستقل طور پر جہاد حریت و استخلاص وطن کو اپنا اصل موضوع بنا کر انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم کو اختیار کرلیا۔

❁ جس پر وہ ع ''وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے!'' کی سی شان کے ساتھ آخر دم تک قائم رہے!

.... (اس ضمن میں بطور تحدیث نعمت ایک واقعہ کا ذکر مناسب ہے۔ آج سے لگ بھگ چار سال قبل زندگی میں پہلی بار حیدرآباد دکن جانا ہوا تو وہاں درس قرآن اور خطابات عام کی بیسیوں مجالس کے علاوہ ایک خطاب مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ میں منعقدہ جلسے میں بھی ہوا جس میں وہاں کے احباب کے بقول حیدرآباد کے تمام مسلمان ارباب فکر و نظر اور اصحاب علم و دانش جمع تھے۔ اس موقع پر جب راقم نے یہ نکتہ بیان کیا کہ ''مولانا آزاد مرحوم کی زندگی کے دو دور بالکل مختلف اور متمائز تھے ایک ۱۹۱۲ء سے ۲۱-۱۹۲۰ء تک کا دور جو اصلاً تسلسل تھا تحریک شہبدین کا...اور دوسرا ۱۹۲۱ء کے بعد کا دور جو حقیقتاً تعلق رکھتا تھا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے! تو ایک جانب تو صدر جلسہ نے جو پرانے کانگریسی رہنما اور تحریک آزادی کے صف اول کے کارکنوں میں سے تھے' اور آزادی کے بعد بھارت کے متعدد صوبوں کے گورنر رہ چکے تھے اور اب ضعیف و نحیف ہی نہیں علیل و صاحب فراش بھی ہیں' بڑے رقت آمیز انداز اور بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا: ''مولانا! آپ نے تو بہت سی پرانی یادیں تازہ کردیں اور پرانے زخموں کو ہرا کردیا''...اور دوسری جانب ایک صاحب نے جو عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کی صدارت سے ریٹائر ہوئے تھے' فرمایا کہ ''میں نے درجنوں طلبہ کو تحریک آزادی ہند کے مختلف گوشوں اور بالخصوص مولانا آزاد کی شخصیت و سیاست کے موضوع پر پی ایچ ڈی کرادی لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود مجھے مولانا مرحوم کی سیرت و شخصیت کا جو فہم آج حاصل ہوا ہے' وہ اس سے قبل نہ تھا!'')

❁ جس طرح بارہویں صدی ہجری کے مجدد اعظم شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی عظمت و جلالت اور خصوصاً جامعیت کبریٰ کا مظہر ان کی تصانیف ہیں۔

❁ اس طرح چودھویں صدی کے مجدد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی عظمت و جامعیت کے مظہر کامل ان کے عظیم تلامذہ ہیں۔

❁ اگر شیخ الہندؒ کی تجویز کامیاب ہوجاتی تو کم از کم اس ''جماعت شیخ الہندؒ'' کا شیرازہ قائم رہتا اور اب اس کا اندازہ بصد حسرت و یاس ہی کیا جاسکتا ہے کہ اس صورت میں اس جماعت کی قوت و شوکت کس قدر ہوتی!

❁ لیکن افسوس کہ حضرت شیخ الہندؒ کی تجویز کی ناکامی کے باعث ان کے انتقال کے بعد رفتہ رفتہ یہ شیرازہ بکھرتا چلا گیا۔

❁ تاہم....جس طرح امام الہندؒ کو یہ کشف ہوا تھا کہ ''میں قائم بالزماں ہوں اور اللہ تعالیٰ جس خیر کا ارادہ فرماتا ہے اس کے لئے مجھے بطور آلہ استعمال فرماتا ہے''

❁ بالکل اسی طرح.....واقعہ یہ ہے کہ شیخ الہندؒ کے بعد کم از کم برعظیم پاک و ہند کی حد تک جو خیر بھی ظاہر ہوا' اگر میں ان کے تلامذہ کا حصہ نمایاں نظر آتا ہے۔

❁ چنانچہ:

❁ .....خالص جہاد حریت و استخلاص وطن کے میدان میں انڈین نیشنل کانگرس کے پلیٹ فارم سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور جمعیت علماء ہند کے پلیٹ فارم سے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور بے شمار علماء کرام نے جو کردار ادا کیا وہ نہایت تابناک ہے۔

❁ (اگرچہ بعد میں کانگرس اور مسلم لیگ کے سیاسی تصادم اور مسلم انڈیا کے مستقبل کے بارے میں اختلاف رائے اور اس کے ضمن میں پیدا ہونے والی تلخی نے ان حضرات کے کردار کی عظمت کو مسلمانان ہند کی عظیم اکثریت کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور وہ متنازعہ

اس کے باوجود کہ راقم کے دینی فکر کا تانا بانا اصلاً علامہ اقبالؒ اور طبعاً مولانا آزادؒ اور مولانا مودودیؒ کی فکر پر مبنی ہے' اس کی قلبی عقیدت و محبت کا رشتہ اصلاً حضرت شیخ الہندؒ اور طبعاً مولانا مدنیؒ اور علامہ عثمانیؒ کے ساتھ ہے۔

شخصیتوں کی حیثیت اختیار کرتے چلے گئے)

❁ اسی طرح مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک اور اس کے نتیجے میں پاکستان کے قیام کے ضمن میں نہایت عظیم اور فیصلہ کن خدمات سرانجام دیں حضرت شیخ الہندؒ کے دوسرے معتمد علیہ رفیق اور شاگرد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے رفقاء نے جن کے ذریعے جماعت شیخ الہندؒ کا پیوند تحریک پاکستان میں لگ گیا۔

.....(اس ضمن میں اس حقیقت واقعی کا استحضار بہت اہم ہے کہ حضرت شیخ الہند نے اپنی زندگی ہی میں اپنی ملی مسائل کے سلسلے میں اپنا دست راست مولانا عثمانی کو بنا دیا تھا۔ چنانچہ شیخ الہند کا خطبہ علی گڑھ بھی ان کے حسب منشاء مولانا عثمانی ہی نے تحریر کیا تھا' اور جمعیت علماء ہند کے اجلاس دہلی' منعقدہ نومبر ۱۹۲۰ء کا خطبۂ صدارت بھی ان کے زیر ہدایت انہی نے لکھا تھا اور ان کے نمائندے کی حیثیت سے پڑھ کر سنایا بھی تھا!)

❁ .....اسی طرح خالص علمی خدمات کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے بیہقیٔ وقت مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ اور ان کے تلامذہ نے جن کی ایک تابناک مثال مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ تھے!

❁ .....رہے مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم تو وہ خود تو ریشمی رومالوں کی تحریک کی ناکامی کے بعد طویل عرصے تک جلاوطن رہے تاہم ان کے دو شاگردوں یعنی مولانا عبدالحیٔ فاروقیؒ اور مولانا احمد علی لاہوریؒ نے ارضِ لاہور میں قرآن کی انقلابی دعوت کے شجرۂ طیبہ کی تخم ریزی اور آبیاری کے ضمن میں نمایاں کردار ادا کیا۔

(چنانچہ لاہور میں راقم کی دعوت قرآنی کو جو پذیرائی حاصل ہوئی اس کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ یہاں کی فضا میں خواجہ عبدالحیٔ فاروقیؒ اور مولانا احمد علی لاہوریؒ کے دروس قرآن کے اثرات موجود تھے.... اور اگرچہ راقم نے خواجہ صاحبؒ کو تو دیکھا تک نہیں' حضرت لاہوریؒ کی زیارت بھی صرف ایک بار ہی ہوئی اور کسی قریبی رابطے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی' تاہم راقم کا گمان غالب ہے کہ اگر اسے نہیں تو اس کی قرآنی تحریک کو بلاشائبہ ریب وشک ان دونوں بزرگوں سے نسبت اویسیؒ حاصل ہے...اس کے دو مظاہر بھی قابل ذکر ہیں۔

ایک یہ کہ جامع مسجد خضراء سمن آباد' جس میں راقم کی دعوت قرآنی کا پودا ابتداً پروان چڑھا اور جہاں لگ بھگ دس سال تک اس دعوت کا غلغلہ پوری شدت کے ساتھ بلند ہوتا رہا' اس زمانے میں آمد و رفت کی شدید دشواریوں کے باوجود لاہور کے کونے کونے سے لوگ وہاں پہنچتے رہے...اس کے بارے میں ایک عرصے کے بعد راقم کو معلوم ہوا کہ اس کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی لاہوریؒ کے دست مبارک کا رکھا ہوا تھا! دوسرے یہ کہ جب لگ بھگ ستر برس کے ایک بزرگ نے میرے تین چار دروس ہی میں شرکت کے بعد ایک روز اچانک میرا ہاتھ کھینچ کر اور اس پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے یہ الفاظ کہے کہ "میں اقامت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد کے لئے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں!" تو فوری طور پر تو میں حیران و ششدر رہ گیا' اس لئے کہ اس وقت تک میں نے تنظیم اسلامی کے قیام کا فیصلہ بھی نہیں کیا تھا' کجا یہ کہ بیعت کا خیال دل میں آتا...لیکن بعد میں جب یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنی نوجوانی میں خواجہ عبدالحیٔ فاروقیؒ کے دروس سنے تھے' بعد ازاں حضرت لاہوریؒ سے نہ صرف دورۂ تفسیر القرآن بلکہ سلوک کی بھی تکمیل کی تھی' تو حیرت ختم ہوگئی اور یہ احساس ہوا کہ "پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا"۔ یہ بزرگ تھے حاجی عبدالواحد مرحوم و مغفور۔ ان کے انتقال پر جو نوٹ "میثاق" میں شائع ہوا

مولانا عبیداللہ سندھی کے دو شاگردوں' مولانا عبدالحیٔ فاروقیؒ اور مولانا احمد علی لاہوریؒ نے ارضِ لاہور میں قرآن کی انقلابی دعوت کے شجرۂ طیبہ کی تخم ریزی اور آبیاری کے ضمن میں نمایاں کردار ادا کیا

تھا وہ بھی اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔)

❁ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی مثبت دعوت... اور دین حق کے غلبہ و اقامت کی راست تحریک کے میدان میں جو خلا مولانا ابوالکلام آزاد کی بددلی اور پسپائی کے باعث پیدا ہوا تھا اسے قدرت نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کے ذریعے پُر کرایا۔

❁ جنہوں نے مولانا آزاد مرحوم کے انتقال موقف کے لگ بھگ نو دس سال بعد ہی اپنی دعوت و تحریک کے لئے ابتدائی اور تمہیدی کام شروع کر دیا۔ اور "حزب اللہ" کے خاتمے کے تقریباً بیس سال بعد "جماعت اسلامی" کے نام سے ایک نیا قافلہ تشکیل دیا!

❁ وہ اگرچہ... نہ براہِ راست حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ یا مسترشد تھے' نہ باضابطہ طور پر کبھی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے منسلک رہے تھے۔

❁ تاہم حقیقت وہی ہے جو مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ نے بیان فرمائی کہ وہ تھے علماء دیوبند ہی کے تربیت یافتہ' اس لئے ان کی صحافتی زندگی کی ابتداء اور تصنیف و تالیف کے شغل کا آغاز جمعیت علماء ہند کے آرگن روزنامہ "الجمعیۃ" ہی کی ادارت سے وابستگی کی صورت میں ہوا تھا۔

❁ اس کے ساتھ ساتھ وہ "الہلال" اور "البلاغ" والے ابوالکلام کی دعوت سے بے حد متاثر تھے' اور انہوں نے ان کے قرآنی فکر اور جہاد فی سبیل اللہ سے متعلق نظریات سے بھرپور استفادہ کیا تھا۔

.....(اس سلسلے میں اگرچہ یہ بات تو نہایت افسوس ناک ہے کہ خود انہوں نے کبھی اس حقیقت کا برملا اعتراف نہیں کیا... تاہم دو مواقع پر غالباً کسی کیف کے عالم میں جو الفاظ ان کے قلم سے ٹپک گئے ان سے یہ حقیقت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے یعنی ایک...وہ الفاظ جن کے ذریعے انہوں نے یہ اعتراف کیا کہ اس دور میں جس شخص سے اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی سب سے زیادہ امیدیں وابستہ تھیں وہ مولانا آزاد تھے اور دوسرے...اس سے کہ انہوں نے مولانا آزاد کو ان کی زندگی ہی میں "مرحوم" قرار دیا جس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولانا آزاد کی ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کی دعوت اور تحریک کے ساتھ ان کی فکری اور جذباتی وابستگی کس درجہ کی تھی اور اس سے ان کی پسپائی کا انہیں کس قدر صدمہ ہوا تھا!)

❁ راقم کے نزدیک مولانا مودودی مرحوم کی سب سے بڑی کمزوری ان کی "انتہا پسندی" تھی جس نے ایک مختصر سے دور کے سوا' ان کی پوری زندگی کو "تضادات" کا مرقع اور رجعتوں کی داستان بنا کر رکھ دیا... اور بالآخر یہی انتہا پسندی ان کی ناکامی کا اصل سبب بنی۔

❁ اگرچہ فوری نتائج کے اعتبار سے یہی ان کی سب سے بڑی "خوبی" اور ابتدائی کامیابیوں کا "راز" بن گئی---- اس لئے کہ جو کوئی ایک بار ان کا گرویدہ ہوا وہ قطعی اور مستقل طور پر بقیہ تمام اکابر امت سے ذہناً و قلباً منقطع اور دوسری تمام دینی تحریکوں اور تنظیموں سے کلیتہً بیزار ہو کر رہ گیا----

❁ اور اس طرح "جماعت بندی" کا کٹھن مرحلہ آسان ہوگیا!

❁ ان کی اس "انتہا پسندی" کا اولین مظہر یہ تھا کہ انہوں نے "متحدہ قومیت" کو نہایت شد و مد کے ساتھ "کفر" قرار دیا---- اور کانگریسی مسلمانوں اور

راقم کی دعوت تحریک کے دو حصے اور شعبے ہیں (۱) دعوت رجوع الی القرآن جس کے لئے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم ہوئی (۲) دین حق کے غلبہ و اقامت کے لئے حرکت و جہاد' جس کے لئے تنظیم اسلامی قائم ہوئی

جمعیت علماء ہند اور اس کی قیادت پر نہایت جارحانہ ہی نہیں حد درجہ دل آزار تنقیدیں کیں۔

❁ اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ ایک جانب 'مسلمانان ہند کی قومی تحریک کو تقویت حاصل ہوئی اور دوسری جانب خود انہیں نہایت وسیع حلقے میں پذیرائی نصیب ہوئی۔

❁ لیکن جمعیت علماء ہند سے وابستہ علماء کرام اور خاص طور پر مولانا حسین احمد مدنیؒ کے عقیدت مندوں کا اکثر و بیشتر حلقہ ان سے شدید بیزار ہو گیا۔

❁ اور دور رس نتائج اور دیرپا عواقب کے اعتبار سے یہی چیز ان کے قدموں کی زنجیر اور ان کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب بن گئی!

❁ اس کے کچھ ہی عرصے بعد انہوں نے ''مسلم قومیت'' کو بھی ''کفر بواح'' کا ہم پلہ قرار دے دیا اور اس کے ساتھ کسی مفاہمت یا تعاون کو ''گناہ کبیرہ'' قرار دیتے ہوئے مسلمانان ہند کی قومی تحریک کی منجدھار سے کٹ کر ''جماعت اسلامی'' کے نام سے اپنا ایک علیحدہ قافلہ تشکیل دے لیا اور

❁ ایک خالص اصولی' اسلامی' انقلابی دعوت و تحریک کی بنیاد رکھ دی۔

❁ اور ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم مولانا مرحوم کی ذاتی و شخصی کوتاہیوں' علمی و فکری لغزشوں اور پالیسی اور طریق کار کے ضمن میں متعدد فاش غلطیوں سے واقف و مطلع اور ان کا قائل و معترف ہونے کے باوجود

❁ اور اس کے باوصف کہ ''جماعت اسلامی'' سے اس کی علیحدگی کو تیس سال سے زائد گزر چکے ہیں۔

❁ آج بھی اس رائے کا حامل ہے کہ:

❁ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک ان کی تحریک اسلامی خالص اصولی اور انقلابی طریق کار پر عمل پیرا اور گویا منہاج نبوت و رسالت پر قائم اور گامزن رہی!

❁ اور اس طرح اس نے اس دعوت و تحریک کے تسلسل کو جاری رکھا جس کے بیسویں صدی عیسوی کے داعیٔ اول تھے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور!

❁ یہی وجہ ہے کہ متعدد اہم اشخاص جو پہلے مولانا آزاد سے بیعت اور ''حزب اللہ'' میں شریک تھے' جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے جیسے مستری محمد صدیقؒ اور ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم!

❁ لیکن افسوس کہ اپنے پیش رو کے مانند اس تحریک کا یہ دور ثانی بھی ع ''خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود!'' کا مصداق کامل ثابت ہوا----اور

❁ تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے موقع پر حالات کی ایک ظاہری اور سطحی تبدیلی سے متاثر ہو کر مولانا مودودی نے اپنی مساعی اور جدوجہد کا رخ ایک قومی و سیاسی تحریک اور انتخابی طریقہ کار کی جانب موڑ دیا۔

❁ اس موضوع پر راقم کو اس وقت زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ:

❁ اولاً اس کی اصل دلچسپی اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور غلبہ دین حق کی اس اصل' اصولی و انقلابی تحریک سے ہے جس کے دو منفصل ادوار کا ذکر اوپر ہوا ہے نہ کہ مولانا مودودی کے اس سے ماقبل یا مابعد کے افکار و نظریات یا پالیسی اور حکمت عملی سے!

❁ ثانیاً اس اصولی انقلابی موقف سے مولانا مودودی کے انحراف یا انقلاب حال کے موضوع پر راقم کی ایک مفصل تالیف ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے موجود ہے۔

❁ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی مرحوم اور جماعت اسلامی کی پالیسیوں کے تضادات کی داستان بہت طویل ہے۔

❁ لیکن جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' راقم کی اصل دلچسپی ان موضوعات سے نہیں ہے بلکہ اسے افسوس اور تشویش صرف اس پر ہے کہ

❁ اسلام کی اصولی انقلابی دعوت اور غلبۂ دین حق کی منہاج نبوت و رسالت والی تحریک:

❁ ع ''اک دمکتا چراغ تھا' نہ رہا!'' کی مصداق بن گئی۔

❁ فوا حسرتا و یا اسفا!

❁ اور اسی خلا کو پر کرنے

❁ اور براہ راست ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ'' کی دعوت و تحریک اور ''غلبہ و اقامت دین'' کی جدوجہد کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی کوشش کا مظہر ہے ''تنظیم اسلامی''

❁ جو راقم کی نسبت سے تو یقیناً نہایت حقیر بھی ہے اور بے وقعت بھی

❁ لیکن اپنے ہدف و مقصود اور اپنے تاریخی پس منظر کے اعتبار سے نہایت اہم بھی ہے اور عظیم بھی!

❁ چنانچہ راقم سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے

❁ کہ راقم کی دعوت و تحریک کے بھی دو حصے اور شعبے ہیں۔

❁ ایک ''دعوت رجوع الی القرآن'' جس کے لئے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم ہوئی اور ''قرآن اکیڈمی'' تعمیر ہوئی۔

❁ دوسرے دین حق کے غلبہ و اقامت یا بالفاظ دیگر ''اسلامی انقلاب'' کے لئے حرکت و جہاد' جس کے لئے ''تنظیم اسلامی'' قائم ہوئی اور اس کی تنظیمی اساس ''بیعت جہاد و سمع و طاعت فی المعروف'' پر استوار ہوئی۔

❁ جہاں تک راقم کی دعوت قرآنی کا تعلق ہے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے۔

❁ اس لئے کہ اگرچہ اس کے ضمن میں تصنیف و تالیف کی مقدار کم رہی' لیکن درس و خطاب اور آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے اس کا چرچا دنیا کے کونے کونے میں ہے۔

❁ مزید برآں' بیس اکیس سالہ مساعی کے نتیجے میں قرآن کے نوجوان داعیوں اور مبلغوں کی ایک ٹیم بھی تیار ہو چکی ہے۔

❁ اور الحمدللہ کہ ان دروس و خطابات کے ذریعے قرآن کے جس فہم و فکر کی اشاعت ہو رہی ہے' وہ کسی ایک کیسر کے فقیر یا کنویں کے مینڈک کے مانند نہیں ہے۔

❁ بلکہ اس میں کم از کم چار منبعوں سے پھوٹنے والے سوتوں کا ''قران السعداء'' موجود ہے یعنی:

❁ ایک: حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا ''رسوخ فی العلم''

❁ دوسرے: ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی جدید فلسفہ و سائنس اور جدید سیاسیات و اقتصادیات کے ضمن میں تنقیدی بصیرت!

❁ تیسرے: مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا جذبہ حرکت و عمل اور تصور جہاد فی سبیل اللہ! اور

❁ چوتھے: مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کا تعمق و تدبر قرآن کا اسلوب و منہاج!

ان حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ طبقہ علماء میں سے کوئی عظیم شخصیت ایسی ابھر کر سامنے آئے جو مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ' امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور مجاہد کبیر سید احمدؒ بریلوی کی سی عظمت و جلالیت نہ سہی کم از کم شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کی سی جامعیت و وسعت کی تو حامل ہو!

(الحمدللہ کہ راقم اس ''دعوت رجوع الی القرآن'' اور اس کے ''منظر و پس منظر'' کے بارے میں تفصیلاً لکھ چکا ہے جس کی اشاعت ''میثاق'' اور ''حکمت قرآن'' میں تو ہو چکی ہے' اب ان شاءاللہ بہت جلد کتابی صورت میں بھی ہو جائے گی)

❁ اور الحمدللہ کہ ع ''شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم!'' کے مصداق

❁ راقم کو پورا اطمینان حاصل ہے کہ اس نے اپنی حیات دنیوی کے بائیس سال ''دعوت الی القرآن'' اور ''تحریک تعلیم و تعلم قرآن'' کی جس جدوجہد میں صرف کئے اس سے اعلیٰ اور ارفع کام اور کوئی نہیں!

❁ اور راقم کو خوف ہے تو صرف اس کا کہ کہیں اس میں نفس اور شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے باعث ریا اور سمعہ کا دخل نہ ہو گیا ہو۔

❁ ورنہ رجا اور استبشار کے لئے تو نبی اکرم ﷺ کے یہ دو ارشادات کفایت کرتے ہیں کہ

❁ ''خیر کم من تعلم القرآن و علمہ'' اور

❁ ''ومن دعا الیہ فقد ھدی الی صراط مستقیم''

❁ البتہ جہاں تک تحریک و تنظیم کا تعلق ہے راقم کو برملا اعتراف ہے کہ اس کی بارہ سالہ مساعی کا حاصل کم از کم بظاہر احوال بہت کم ہے!

❁ اور الحمدللہ کہ اس کے سبب کے بارے میں بھی راقم کو نہ کوئی مغالطہ لاحق ہے' نہ ہی وہ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مرض میں مبتلا ہے۔

❁ چنانچہ اپنے خوب معلوم ہے کہ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ اقامت دین کے بلند و بالا نصب العین اور ''اظہار دین الحق علی الدین کلہ' یا بالفاظ دیگر ''اسلامی انقلاب'' کی جاں گسل جدوجہد بالخصوص اس کی قیادت و رہنمائی کے لئے جو کم از کم استعدادات اور صلاحیتیں درکار ہیں وہ ان سے بھی تہی دست ہے!

❁ گویا معاملہ وہی ہے جو مولانا حسرت موہانی کے اس شعر میں بیان ہوا کہ:

غم زندگی کا حسرت سبب اور کیا بتائیں
مری ہمتوں کی پستی' مرے شوق کی بلندی!

❁ صرف اس فرق کے ساتھ کہ جہاں تک راقم کا تعلق ہے معاملہ ''شوق'' کا نہیں' خالص ''احساس فرض'' کا ہے!

❁ چنانچہ یہی احساس فرض تھا جس کے تحت راقم نے عمر عزیز کے پورے دس سالی ''تحریک جماعت اسلامی'' کی نذر کئے اور اس عرصے کے دوران ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے لیکن نہایت فعال انداز میں کام کیا۔

❁ پھر جب اس سے مایوس ہو کر علیحدگی اختیار کی تو آٹھ برس اس انتظار میں بسر کئے کہ جماعت سے علیحدہ ہونے والے بزرگ علماء میں سے کوئی صاحب عزیمت و ہمت نیا قافلہ تشکیل دے تو راقم اس میں ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے شامل ہو کر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے!

❁ اور جب اس جانب سے بھی مایوسی کا سامنا ہوا تو مجبوراً خود اس کانٹوں بھری وادی میں قدم رکھنے کے فیصلے کے ساتھ دوبارہ وارد لاہور ہوا!

❁ اور پورے دس برس صرف ''قرآن کی انقلابی دعوت'' کی نشر و اشاعت کا کام کیا' (سات سال خالص انفرادی حیثیت میں اور تین سال ''مرکزی انجمن خدام القرآن'' لاہور کے زیر عنوان)

❁ اور بالآخر جب ۱۹۷۴ء میں ''عزم تنظیم'' کا اعلان کیا اور مارچ ۱۹۷۵ء میں ع ''ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا'' کے مصداق ''تنظیم اسلامی'' کے نام سے ایک نیا قافلہ ترتیب دیا---تب بھی ''ہیئت تنظیم'' کے ضمن میں آخری فیصلہ نہیں کیا' بلکہ اسے اس خیال سے موخر رکھا کہ کوئی بزرگ شخصیت بھی شامل ہو تو اس کی صوابدید کے مطابق اقدام کیا جائے!

❁ اور دو ڈھائی سال کے لاحاصل انتظار کے بعد تنظیمی ڈھانچے کی اساس کے طور پر ''بیعت سمع و طاعت فی المعروف'' کے اس اصول کو اختیار کرنے کا اعلان کر دیا جو راقم کے نزدیک اسلامی اجتماعیت کی واحد منصوص و مسنون بنیاد ہے!

❁ اس طرح الحمدللہ کہ ''استدار الزمان کھیئتہ یوم خلق اللہ السموات والارض'' کے مانند غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد کے تنظیمی ڈھانچے کی ہیئت جو ٹھیٹھ اسلامی مدار سے ہٹ گئی تھی دوبارہ اپنے صحیح نہج پر استوار ہو گئی۔

❁ ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کو اپنی جملہ کوتاہیوں اور کمزوریوں اور تمام تر بے بضاعتی اور تہی دامنی کے ساتھ ساتھ الحمدللہ کہ یہ اطمینان حاصل ہے کہ:

❁ اولاً اسے اپنی بے بضاعتی اور تہی دامنی کا پورا شعور و ادراک حاصل ہے۔

❁ ثانیاً سلف صالحین اور علماء ربانیین کے حلقے سے ذہناً و قلباً منسلک ہے'

احب الصالحین ولست منھم
لعل اللہ یرزقنی صلاحا

❁ ثالثاً: اس کے فکر و نظر میں نہ تنگی ہے' نہ افراط تفریط---چنانچہ اس کے باوجود کہ اس کے دینی فکر کا تانا بانا اصلاً علامہ اقبال اور تبعاً مولانا آزاد اور مولانا مودودی کے فکر پر مبنی ہے' اس کی قلبی محبت و عقیدت کا رشتہ اصلاً حضرت شیخ الہند اور تبعاً مولانا مدنی اور علامہ عثمانی سے ہے اور ان دونوں موخرالذکر بزرگوں کے ضمن میں بھی راقم اپنے باطن میں ایک عجیب توازن کی لذت و حلاوت محسوس کرتا ہے' کہ اگر اصابت فکر و نظر کے ضمن میں راقم زیادہ قائل ہے علامہ عثمانی کا---تو تقویٰ و تواضع اور عزیمت و استقامت کے ضمن میں زیادہ معترف ہے مولانا مدنی کا!

❁ مزید برآں اس کے نزدیک مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ کسی متحدہ قومیت میں شامل ہونا اصلاً تو غلط ہے' تاہم کسی وقتی اور فوری دفاعی تدبیر کے طور پر اس کا استعمال ہرگز حرام نہیں ہے' رہی مسلمانوں کی دنیوی فلاح و بہبود کے لئے کی جانے والی ''قومی'' مساعی تو وہ راقم کے نزدیک احیائے ملت کے وسیع پروگرام کا ایک جزو لاینفک ہیں---اگرچہ خالص غلبہ اسلام اور اقامت دین کے لئے اٹھنے والی ٹھیٹھ تجدیدی مساعی کو ان دونوں سے بالاتر ہو کر خالص اصولی' انقلابی خطوط پر استوار ہونا چاہئے۔

❁ رابعاً: اسے نہ کوئی غرور لاحق ہے نہ زعم---بلکہ وہ شدید احتیاج محسوس کرتا ہے علماء ربانیین بالخصوص متقدمین حضرت شیخ الہند کی سرپرستی اور تعاون کی!

❁ چنانچہ اسی کے حصول کی کوشش کی مظہر ہے اس کتاب کی تالیف و اشاعت!!

❁ ''گر قبول افتد زہے عز و شرف!''

(واضح رہے کہ یہ تحریر سرزمین حرم پر یہیں تک سپرد قلم ہو سکی تھی اور اس کے آخری الفاظ ۲۷ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۹۸۷ء کو مکہ مکرمہ زادہ اللہ شرفہا میں ضبط تحریر میں آئے تھے۔ اس کا باقی حصہ واپسی پر لکھا گیا ہے۔)

❁ اس وقت پوری دنیا میں اسلام اور مسلمان جس حال میں ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔

❁ یعنی یہ کہ---اگرچہ بظاہر مسلمان ممالک کی عظیم اکثریت مغربی سامراج کی غلامی سے نجات حاصل کر چکی ہے (چنانچہ اس وقت یو این او کے کل ۱۵۹ ممبر ممالک میں سے ۴۴ کی تعداد مسلمان ممالک پر مشتمل ہے!)

❁ لیکن ایک جانب یہ تمام مسلمان جدید ٹیکنالوجی اور خاص طور پر اسلحہ کے لئے بالکلیہ دوسروں کے دست نگر اور کسی نہ کسی سپر پاور کے فتراک کے نخچیر ہونے کے علاوہ اکثر و بیشتر باہم دست و گریبان ہیں۔

❁ تو دوسری جانب اسلام فرمان نبوی ''بدء الاسلام غریبا و سیعود کما بدا'' کی کامل تصویر ہے۔

❁ اور اس کے بارے میں لگ بھگ ایک صدی قبل کے یہ اشعار آج بھی صد فی صد درست ہیں کہ:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے!

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جذر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

❁ اور ؎

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے!

❁ اس لئے کہ ان نام نہاد مسلمان ممالک میں قیادت وسیادت کی باگ دوڑ اور حکومت وسیاست کی زمام کار گورے یورپین لوگوں کے جانے کے بعد ان لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی ہے جو صرف چمڑی کی رنگت کے سوا ذہن وفکر اور تہذیب وتمدن ہر اعتبار سے خالص ''یورپین'' ہیں!

❁ اہل تشیع تو پھر بھی فخر کے ساتھ سر اونچا کر سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے واحد اکثریتی ملک میں اپنے نظریات کے مطابق ''اسلامی انقلاب'' برپا کر دیا اور اس سے قطع نظر کہ یہ انقلاب عارضی ثابت ہوتا ہے یا پائیدار' کم از کم فی الوقت ایک وسیع وعریض ملک پر اپنے عقائد اور اپنی فقہ کی غیر مشروط بالادستی بالفعل قائم کر دی۔

❁ پوری سنی دنیا کے لئے تو

''یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے!''

❁ کے مصداق واقعتاً ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ان کے درجنوں اکثریتی ممالک میں سے سوائے ایک سعودی عرب کے' کسی ایک جگہ بھی شریعت اسلامی کی فیصلہ کن بالادستی قائم نہیں!

❁ اور خود سعودی عرب میں بھی اگرچہ داخلی طور پر نظام عبادات کے سرکاری سطح پر قیام واہتمام اور شریعت اسلامی کی جزوی تنفیذ وترویج کی برکات نظر آتی ہیں

❁ تاہم ایک مستبد بادشاہت اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نے اسے پوری بیرونی دنیا کے لئے نفرت وحقارت کا ہدف اور تمسخر واستہزاء کا موضوع بنا کر رکھ دیا ہے۔

❁ گویا آج پوری سنی دنیا کم از کم قومی واجتماعی اور ملی وملکی سطح پر شہادت حق کی بجائے شہادت زور پر عمل پیرا ہے۔ اور نوع انسانی کو اسلام کی دعوت دینے اور اس پر حجت قائم کرنے کی بجائے عملی اعتبار سے خود اسلام سے نفرت اور بیزاری کا اظہار کر رہی ہے!

❁ ادھر برعظیم ہند کی تقسیم سے ۱۹۴۷ء میں وقت کی جو عظیم ترین مسلمان مملکت وجود میں آئی تھی وہ پندرہ سولہ سال قبل ایک عظیم حادثے سے دوچار ہوگئی' جس نے نہ صرف یہ کہ اسے دولخت کر دیا بلکہ ایک نہایت شرمناک شکست اور ذلت آمیز ہزیمت کا کلنک کا ٹیکہ پوری امت مسلمہ کی پیشانی پر لگا دیا۔

❁ نتیجتاً آج وہ اندیشہ واقعہ کی صورت اختیار کر کے سامنے آ گیا ہے' جس کا اظہار اب سے لگ بھگ نصف صدی قبل کچھ مخلصان ملت نے کیا تھا---- یعنی یہ کہ مسلمانان برعظیم تین حصوں میں تقسیم ہو کر ضعیف وغیر موثر ہو گئے ہیں!

❁ اور نوبت بایں جا رسید' کہ آئے دن بھارت کا کوئی نہ کوئی علاقہ ؏

''ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو!''

❁ کا نقشہ پیش کرتا رہتا ہے' لیکن بنگلہ دیش کے دس کروڑ اور بچے کھچے پاکستان کے نو کروڑ مسلمان چند ایک اخباری مضامین وبیانات---- اور ایک آدھ چھوٹے موٹے مظاہرے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے!

❁ رہا یہ بچا کھچا پاکستان!---- تو دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ یہ رفتہ رفتہ خوفناک ترین تباہی کی جانب بڑھ رہا ہے---- اور ''کنتم علی شفا حفرۃ من النار'' کا کامل مصداق بن چکا ہے۔

❁ اور اگر جلد ہی مشیت وقدرت خداوندی کا کوئی خصوصی اور معجزانہ ظہور نہ ہوا---

❁ اور یہاں اسلامی انقلاب نہ آیا

❁ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے چار ٹکڑے ہوں گے یا پانچ!

بہرصورت

❁ بھارت میں مسلم دشمنی ہی نہیں باضابطہ مسلم کشی کی تیز و تند لہر---- اور پاکستان میں نسلی' لسانی اور علاقائی عصبیتوں کے بڑھتے ہوئے طوفان کے پیش نظر یہ اندیشہ اور خطرہ موہوم نہیں' واقعی اور حقیقی ہے کہ برعظیم پاک وہند میں ؏

''ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات!''

کا وہ اٹل قانون قدرت نافذ نہ ہو جائے جو آج سے ٹھیک پانچ سو برس قبل یہیں میں ہوا تھا!

ع ''حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!''

(اس موضوع پر الحمدللہ کہ راقم کی دو کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں یعنی ''استحکام پاکستان'' اور ''استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ'' لہٰذا اس مقام پر کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے!)

❁ ان حالات میں ضرورت تو اس امر کی ہے کہ طبقہ علماء میں سے کوئی عظیم شخصیت ایسی ابھر کر سامنے آئے جو مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ' امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی اور مجاہد کبیر سید احمد بریلویؒ کی سی عظمت وجلالت نہ سہی کم از کم شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ کی سی جامعیت وسعت کی تو حامل ہو---- جو

❁ اولاً ؏

''کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو!''

کے مصداق ''جماعت شیخ الہند'' کے باقیات الصالحات کو جمع کرے اور اس کی منتشر لڑیوں کو از سر نو ایک مضبوط رسی کی صورت میں بٹ دے!

❁ ثانیاً ان جملہ دینی عناصر کو جمع کرنے کی کوشش کرے جو جمعیت علماء ہند کے ابتدائی دور میں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔

(واضح رہے کہ اس وقت مسلمانان ہند کے اس مشترک دینی وسیاسی اتحاد سے صرف مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کے فرزند ہی باہر رہ گئے تھے' باقی جملہ قابل ذکر حنفی اور اہل حدیث علماء اس اتحاد میں شامل تھے)

❁ اس لئے کہ اس کے بغیر پاکستان میں کسی اسلامی انقلاب کے خواب دیکھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے!

❁ تاہم جب تک کوئی ایسی صاحب ہمت وعزیمت شخصیت سامنے نہیں آتی'

❁ ان سطور کا عاجز وناچیز راقم اپنی بساط بھر کوشش کرتا رہے گا کہ غلبۂ اسلام اور اقامت دین کی اس راست تحریک کے تسلسل کو قائم رکھے جس کے اس صدی کے داعیٔ اول تھے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور داعیٔ ثانی تھے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم

❁ اور بحمداللہ وہ اس پر پوری طرح مطمئن ہے کہ خواہ اسے تنظیم کی وسعت کے اعتبار سے تا حال نمایاں اور محسوس کامیابی حاصل نہیں ہوئی' تاہم اسے اللہ نے توفیق عطا فرمائی کہ اس نے:

❁ دروس قرآن اور خطابات عام اور ان کی آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے وسیع پیمانے پر نشر واشاعت کے ذریعے' نہ صرف یہ کہ دین اور فرائض دینی کا جامع اور ہمہ گیر تصور بہت بڑے حلقے میں عام کیا' بلکہ مطالعہ قرآن کے ایک منتخب نصاب کے ذریعے اس کا نہایت مضبوط و مستحکم تعلق قرآن حکیم کے ساتھ استوار کر دیا ہے۔

❁ مزید برآں' انقلاب اسلامی کے اساسی لوازم اور تدریجی مراحل کو وضاحت کے ساتھ معین کیا اور اس کا گہرا رشتہ سیرت النبی ﷺ کے ساتھ اس طرح قائم کر دیا کہ **''لایصلح اخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا''** کی حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔

❁ اور---- ثم الحمدللہ---- کہ وہ اس پر پوری طرح راضی ہے کہ اگر اسے معاشرے اور قوم کے اکابر واصاغر سے تائید وتعاون حاصل نہ ہو تو وہ یہی دو کام کرتا ہوا دنیا سے رخصت ہو جائے!

❁ تاہم---- پاکستان کے علماء حقانی اور صلحاء ربانی کی خدمت میں یہ کتاب **''من انصاری الی اللہ''** کی صدا کے ساتھ پیش ہے' مبادا وہ یہ کہیں کہ تم نے ہمیں کبھی پکارا ہی نہیں!

❁ ورنہ **''وما النصر الا من عنداللہ''** کے مطابق نصرت تو بالکلیہ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔

قیام پاکستان کے مخالف علماء

کے موقف کا جائزہ اور منصفانہ تجزیہ

ڈاکٹر اسرار احمد

> **یہ محض رائے کا اختلاف تھا ورنہ ان علماء کا خلوص و اخلاص ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھا**

جب یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کے قیام کی بنیاد صرف اور صرف اسلام تھی تو ذہنوں میں خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تحریک پاکستان کا اسلام کے ساتھ اتنا گہرا رشتہ تھا تو پھر بعض بڑی دینی شخصیتوں یا دینی جماعتوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کیوں کی تھی؟ ان میں مولانا ابوالکلام آزادی جیسی نابغۂ روزگار شخصیت کا نام بھی آتا ہے۔ تقویٰ و تدین کے اعتبار سے مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسی عظیم شخصیت کا بھی ان افراد میں شامل تھی۔ اسی طرح جمیعت علمائے ہند جیسی مضبوط اور طاقتور جماعت جس کا دائرہ کار پورے ہند میں پھیلا ہوا تھا اور پنجاب میں مجلس احرار اسلام جیسی عوامی جماعتیں بھی قیام پاکستان کی مخالف تھیں۔ چنانچہ اس پس منظر میں یہ سوال کچھ غلط بھی نہیں کہ آخر یہ سب پاکستان کے کیوں مخالف تھے؟ ان کا مؤقف کیا تھا؟ ان کے دلائل کیا تھے؟ کیا وجہ ہوئی کہ عام مسلمانوں نے ان حضرات کے بجائے قائداعظم اور مسلم لیگ کے مؤقف کو قبول کرنا پسند کیا؟

یہ موضوع بڑا حساس ہے' کیونکہ عموماً ہمارا معاملہ یہ ہے کہ جن سے محبت یا عقیدت ہوتی ہے ان پر کوئی تنقید برداشت نہیں کر سکتے۔ یا جن سے ہمیں اختلاف ہو جائے ان کے بارے میں ہم کوئی کلمہ خیر سننے کو تیار نہیں ہوتے یا ان کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان میں کوئی خوبی بھی ہو سکتی ہے۔ تاہم ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تمام تر خوبیوں اور عظمتوں کے باوجود یہ شخصیات انسان تھیں اور از روئے حدیث انسان خطاو نسیان سے مرکب ہے۔ البتہ ہمیں کسی بھی صورت ان کے ادب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔

قیام پاکستان کے مخالف علماء کے مؤقف کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے یا ان کے مؤقف کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہندوستان میں اسلام کی آمد کا ایک تاریخی نقشہ ذہن میں تازہ کر لیا جائے۔

ہندوستان میں اسلام تابعین کے دور میں بڑے زور دار انداز میں بذریعہ سندھ داخل ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب اسلام میں فرقے' فقہی مسالک یا صوفیائے کرام کے سلسلے وجود میں نہ آئے تھے اور اسلام ابھی عجمی فلسفوں کے اثرات سے بھی محفوظ تھا۔ چنانچہ تابعین کے دور یعنی ۹۳ھ میں محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا اور اس خطے میں اسلام کو روشناس کرایا۔ اس دور میں موجودہ پاکستان کا تقریباً سارا علاقہ اسلام کے زیر اثر آچکا تھا۔ تاہم یہ دور جلد ہی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد اسلام جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں میں مسلمان تاجروں کے ذریعے پہنچا۔ لیکن یہاں کوئی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ البتہ آہستہ آہستہ اسلام پھیلتا رہا۔ قوت کے ساتھ اسلام ۲۵۰ برس کے بعد ۸۱۔۱۹۸۰ء میں محمود غزنوی کے دور میں آیا۔ اس دور میں بھی موجودہ پاکستان اور شمالی پنجاب کا بڑا حصہ دارالاسلام بن چکا تھا۔ تین سو برس تک اسلام اسی علاقے تک محدود رہا۔ ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک نے تخت دہلی پر قبضہ کیا۔ جس کے بعد ساڑھے چھ سو برس تک مختلف خاندان دہلی پر حاکم رہے۔ اسی دور میں صوفیائے کرام کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس دور میں سب سے بہترین دور خاندان غلاماں کا تھا۔ تخت دہلی پر مسلمانوں کے دور حکومت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصے میں خاندان غلاماں' خلجی' تغلق' خاندانِ سادات اور لودھی حاکم رہے۔ ۱۵۲۶ء میں ظہیرالدین بابر نے مغلوں کی حکومت قائم کی جو ۱۸۵۷ء تک قائم رہی۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں مغلوں کی حکومت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ مرکزی حکومت کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ نواب' مہاراجے' مختلف علاقوں پر قابض تھے۔ اسی دور میں انگریزنے بھی یہاں قدم جمانا شروع کر دئے تھے۔ ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کی فتح کے بعد تو گویا انگریز بھی اقتدار میں حصہ دار بن گئے۔ اس کے علاوہ جنوبی اور وسطی ہند پر مرہٹے قابض تھے۔ وہ بڑی مضبوط قوت تھی اور اسلام کو ختم کرنے کے درپے تھی۔ اورنگزیب مسلسل ۲۵ سال تک ان سے برسرپیکار رہا اور کسی حد تک ان کی قوت کو کچل ڈالا لیکن اس کے بعد وہ فوراً پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے احمد شاہ ابدالی کو ان کی سرکوبی کے لئے پکارا۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی نے دوبارہ ان کی کمر توڑی۔ آج ہندوستان میں آر ایس ایس والے ان مرہٹوں ہی کے وارث ہیں جو بھارت سے اسلام کا نام ونشان مٹانے کے خواہشمند ہیں۔ بہرحال مرہٹوں کے کچھ عرصہ بعد سکھ قوت اُبھری۔ اٹھارویں صدی کا آخری واقعہ ٹیپو سلطان کی شہادت تھی۔ ٹیپو سلطان نے انگریزوں کو ایک طویل عرصہ تک روکے رکھا۔ ۱۷۹۸-۹۹ء میں ٹیپو سلطان بھی نہ رہے اور جنوبی ہند بھی انگریزوں کے زیر اثر آگیا۔

انیسویں صدی میں سید احمد بریلوی شہید نے ہندوستان میں خالص اسلامی بنیادوں پر جہاد شروع کیا۔ انہوں نے پہلے دعوت' تربیت' تنظیم اور بیعت کی بنیاد پر جماعت بنائی اور جہاد کیا۔ ان کے پیش نظر ہندوستان کو دوبارہ دارالاسلام بنانا تھا۔ ۱۸۳۱ء میں سید صاحب نے بالاکوٹ کے مقام پر جام شہادت نوش کیا۔ اگرچہ سید صاحب نے اولاً سکھوں کے خلاف جہاد شروع کیا تھا۔ لیکن سکھوں سے نپٹنے کے بعد وہ انگریزوں کو یہاں سے نکالنا چاہتے تھے۔ اس اعتبار سے انگریزوں کو نکالنے کی یہ خالص اسلامی کوشش تھی جو بدقسمتی سے کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد دوسری کوشش ۱۸۵۷ء میں ہوئی۔ یہ ہندو مسلم متحدہ کوشش تھی۔ مگر یہ کوشش بھی ناکام ہوئی۔ تاہم اس آخری کوشش میں ناکامی کے بعد ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے تحت آگیا۔ برطانیہ کے زیر اثر ہندوستان میں اب تلوار کے بجائے قلم کی حکومت کا دور آگیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو اپنی عددی اکثریت کے بل پر ہر میدان میں چھاگئے اور مسلمان جو کبھی ہندوستان پر حاکم تھے' بہت پیچھے رہ گئے۔

انگریزوں کی طرف سے ہندوؤں کی پذیرائی اور مسلمانوں کے زوال کے اسباب یہ تھے کہ انگریز کی آمد پر مسلمانوں کا ردعمل کچھ اور تھا ہندوؤں کا کچھ اور۔ مسلمان حاکم سے محکوم بن گئے تھے۔ وہ انگریز کو اپنا دشمن سمجھتے تھے' جبکہ انگریز کو بھی مسلمانوں سے خوف تھا کہ چونکہ ہم نے حکومت ان سے چھینی ہے اس لئے یہ بھی

بھی ہمارے وفادار نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا انگریز نے مسلمانوں کو پیچھے ہٹایا اور ہندوؤں کو آگے بڑھایا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندو صرف ہندوستان میں تھا جبکہ مسلمان عالمی برادری تھے۔ انگریز جس کی حکومت دنیا کے ایک بڑے حصے پر قائم تھی اور بیشتر اسلامی ممالک اس کے زیر نگین تھے' اسے نظر آ رہا تھا کہ دنیا میں کہیں بھی مسلمانوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہندوستان کے مسلمان ان کی حمایت کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس خدشے کے پیش نظر بھی اس نے یہاں مسلمانوں کو دبایا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ ہندو نے بڑی جلدی اپنے کلچر کو چھوڑ کر انگریزی کلچر کو اپنا لیا جبکہ مسلمانوں نے انگریزی حکومت اور ان کی ثقافت کا مکمل بائیکاٹ کیا جس کے باعث مسلمان پیچھے رہ گئے۔

ان حالات میں سرسید احمد خان نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان دو دھاروں میں بٹ گئے۔ ایک وہ مسلمان تھے جنہوں نے سرسید کی بات کو درست سمجھا اور آگے آئے۔ دوسرا طبقہ علمائے کرام کا تھا جنہوں نے خود کو قال اللہ و قال الرسولؐ تک محدود کر لیا اور اپنے آپ کو زمانے کے اثرات سے محفوظ کرنے کے لئے مدرسوں میں بند کر لیا۔ جب تک تلوار کی حکمرانی تھی ہندو مسلمانوں سے دب کر رہا لیکن جیسے ہی تلوار کا دور ختم ہوا ہندو کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا اور اس کے ساتھ ہی ہندوؤں میں اپنے مذہب کو زندہ کرنے اور مسلمانوں سے ہزار سالہ شکست کا بدلہ لینے کا جذبہ بھی ابھرا۔ ادھر مسلمانوں کو بھی خوف لاحق ہو گیا کہ اگر ہندو اسی طرح آگے بڑھتا رہا تو انگریز کے جانے کے بعد یہ ہمیں ہر میدان میں دبائے گا اور ہمارے لئے اپنے دین پر قائم رہنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ یہی خوف آگے چل کر تحریک پاکستان کی بنیاد بنا۔

بیسویں صدی میں عظیم ترین شخصیت اور چودھویں صدی کے مجددِ اعظم شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ اسیرِ مالٹا نے ایک بار پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملا کر انگریز کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کی۔ جس کی پاداش میں انہیں مالٹا میں قید کر دیا گیا۔ شیخ الہند کے بعد سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ان کے جانشین بنے۔ انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہم پہلے ہندو کے ساتھ مل کر انگریز کو یہاں سے نکال باہر کریں بعد میں ہندو سے بھی نپٹ لیں گے۔ دراصل علماء کرام کے اس طبقے کی طرف سے قیام پاکستان کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ انہیں ہندوؤں کے عزائم کا درست اندازہ نہیں تھا' کیونکہ علماء کرام نے خود کو مدارس تک محدود کر لیا تھا۔ جس کے باعث انہیں معاشی میدان میں ہندو سے کسی مسابقت کا سامنا نہ تھا' اس لئے ہندو کے کیا عزائم ہیں؟ علمائے کرام اس کا اندازہ نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے انہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی۔ دوسری طرف عام مسلمانوں کو معاشی میدان میں بھی اور سرکاری ملازمتوں میں قدم قدم پر ہندو کی متعصبانہ ذہنیت کا تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس معاملے میں علمائے کرام کے بجائے مسلم لیگ کے علیحدہ ملک کے قیام کے موقف کی بھرپور حمایت کی جس کے نتیجے میں پاکستان قائم ہو گیا۔

یہ محض رائے کا اختلاف تھا ورنہ ان علماء کا خلوص و اخلاص ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھا' یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک موقع پر کہا تھا کہ پاکستان کی عزت سے اسلام کی عزت وابستہ ہے اور اب اس کو مستحکم کرنا ہماری دینی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی قیام پاکستان کے بعد اپنے ایک خطاب کے دوران پاکستان کو مسجد سے تشبیہہ دیتے ہوئے اس کی حفاظت کو ایمان کا تقاضا قرار دیا تھا۔

ویسے بھی ہمارا دین ہمیں ایک دوسرے سے اختلاف کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس لئے قیام پاکستان کے حوالے سے علماء کرام اور مسلمانوں کا یہ اختلاف کوئی گناہ نہیں تھا۔ لیکن ہم لوگ جنہوں نے علیحدہ ملک کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔ وہ اس ملک میں اسلام نافذ نہ کر کے اللہ تعالیٰ سے وعدہ خلافی کے عظیم گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں کیونکہ ہم نے اللہ سے یہ عہد کیا تھا کہ اے اللہ تو ہمیں انگریزوں اور ہندوؤں کی دہری غلامی سے نجات دلا دے اور ہمیں ایک علیحدہ خطہ عطا کر دے جہاں ہم تیرے دین کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ ہم اپنے اس وعدہ میں خیانت کا ارتکاب کر کے اللہ کے غضب کو دعوت دے رہے ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کا دولخت ہونا اسی وعدہ خلافی پر ہماری سزا تھی تاکہ ہم سنبھل جائیں۔ اگر ہم نے اب بھی اپنی روش ترک نہ کی تو ہو سکتا ہے کہ ۱۹۷۱ء جیسی کوئی اور سزا ہمیں بھگتنا پڑے جس کے آثار بھارت کے حالیہ عزائم سے صاف نظر آ رہے ہیں۔

---

① بقیہ: منبر و محراب

اور پولیس کا چھاپہ شرمناک واقعہ ہے اور خانقاہ میں موجود انڈیا سے آئے ہوئے مہمان علماء کرام اور خدام کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر گرفتار کرنے' جانوروں کی طرح گاڑیوں میں ٹھونسنے نیز چادر اور چار دیواری کے تقدس کو پامال کرنے سے دنیا بھر میں ملک کی بدنامی ہوئی ہے لہٰذا میں حکومت سے مطالبہ کرتا ہوں کہ اس واقعہ میں ملوث افسران اور ملازمین کو فی الفور برطرف کر کے علی الاعلان اس واقعہ پر معافی مانگی جائے۔

تمام نمازیوں نے اس قرارداد کی ہاتھ اٹھا کر مکمل تائید کی۔

---

② بقیہ: منبر و محراب

بہر حال مجدد وقت کی بات نہ ماننے کی علماء کو یہ سزا ملی کہ ان کی سیاسی قیادت ختم ہو گئی اور دینی سیاسی جماعتیں بتدریج سیکولر سیاسی جماعتوں کا ضمیمہ بن کر رہ گئیں۔ اس کی تلافی کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ وہ دینی جماعتیں جو انتخابی سیاست کے میدان میں سرگرم عمل ہیں' اپنے طرز عمل اور طریق کار پر ناقدانہ نگاہ ڈالیں' انتخابی سیاست کے میدان سے دستکش ہو کر احتجاجی اور مطالباتی سیاست کی راہ اپنائیں اور ایک مضبوط پریشر گروپ کے طور پر نفاذ شریعت اور اقامت دین کے لئے تحریک چلائیں۔

حالات حاضرہ

چیف ایگزیکٹو پرویز مشرف جب اقتدار میں آئے تو ان کی بغل میں دو کتے تھے لیکن تھیلے میں ایک بلی بھی تھی جو اس وقت باہر نہیں آئی تھی۔ تاہم ان کے اس اعلان سے کہ وہ آئندہ صدر بنیں گے اور فوج سے ریٹائر نہیں ہوں گے گویا وہ بلی بھی تھیلی سے باہر آ گئی ہے۔ دراصل فوج کتنی بھی نیک نیتی سے حکومت چلانے کی ذمہ داری ادا کرے چھوٹے صوبوں میں یہ احساس محرومی لازماً پیدا ہو گا کہ یہ پنجابی فوج ہے اور پنجاب ہم پر حکومت کر رہا ہے۔ لہٰذا کچھ ہی عرصے بعد چھوٹے صوبوں میں اس حکومت کے خلاف شدید ردعمل پیدا ہو گا جیسے جنرل ایوب اور جنرل ضیاء کے خلاف ہوا تھا۔ چنانچہ بحالی جمہوریت کی تحریک جب چلے گی تو ماضی کی طرح دینی جماعتیں بھی اس میں شامل ہو جائیں گی اور اس اکھاڑ پچھاڑ کے نتیجے میں ایک بار پھر ہمیں ابتداء سے اپنے جمہوری سفر کا آغاز کرنا ہو گا۔

چیف ایگزیکٹو کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگرچہ یہاں جمہوریت کا پودا پھل پھول نہیں سکا لیکن جمہوریت یہاں کے عوام کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ملک ایک جمہوریت عمل کے نتیجے میں ہی معرض وجود میں آیا تھا۔ لہٰذا اپنے اقتدار کو طول دینے کی ان کی خواہش ملک و ملت کے لئے سخت نقصان دہ ہو گی۔

اس منحوس چکر سے نکلنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ دینی جماعتیں کشمکش اقتدار سے الگ رہتے ہوئے اپنا الگ اتحاد بنائیں اور نفاذ اسلام کے لئے خالص دینی ایشوز پر بھرپور تحریک چلائیں تو یہاں اسلامی انقلاب برپا ہو سکتا ہے جس پر ملک کے استحکام اور بقاء کا انحصار ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے معروف کالم نگار اور ادیب صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی کی صحت یابی کے لئے اجتماعی دعا بھی کرائی۔

نظام خلافت' کب اور کہاں؟

مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ خلافت کا احیاء اسی ملک خداداد پاکستان سے ہوگا۔ البتہ ایک سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے کہ یہ احیاء کب ہوگا؟ ویسے بھی میں کیا جواب دوں گا جبکہ قرآن نے خود حضور ﷺ سے قیامت یا عذاب الٰہی کے بارے میں کہلوادیا:

''میں نہیں جانتا کہ (جس بات کی تمہیں خبر دی جارہی ہے) جو وعدہ تم سے کیا جارہا ہے وہ قریب ہے یا دور!''

اسی طرح سورۂ جن میں آیا ہے:

یعنی'' مجھے معلوم نہیں ہے کہ (جو خبر تم کو دی جارہی ہے) جو وعدہ تم سے کیا جارہا ہے وہ قریب آچکا ہے یا ابھی اس میں تمہارا رب کوئی تاخیر کرے گا۔''

اسی خطے سے نظام خلافت کے احیاء کا یقین مجھے بہرحال حاصل ہے۔ اب میں اس کی تائید میں دو حدیثیں پیش کررہا ہوں۔ ایک حدیث ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن حارثؓ سے روایت کی ہے:

''مشرق سے فوجیں نکلیں گی جو مہدی کی حکومت قائم کرنے کے لئے منزل پر منزل مارتی چلی آئیں گی۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مشرق کے کسی علاقے میں وہ نظام خلافت پہلے قائم ہو چکا ہوگا۔ دوسری حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے اور اس کو امام ترمذیؒ نے اپنی ''جامع'' میں روایت کیا ہے:

''خراسان کی جانب سے علم چلیں گے' ان کو کوئی روک نہ سکے گا جب تک کہ وہ ایلیاء میں جا کر نصب نہ ہو جائیں۔''

حضور ﷺ کے زمانے میں یروشلم کا نام ایلیاء تھا) خراسان اس علاقے کا نام ہے جس کا کچھ حصہ اس پاکستان میں ہے اور زیادہ تر حصہ افغانستان میں ہے۔ گویا یہی علاقے ہیں جہاں سے خلافت کا آغاز ہوگا۔

بظاہر بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی' کیونکہ عربوں کے بعد سب سے مجرم قوم مسلمانان پاکستان ہیں۔ اس وقت پاکستان' ننگے سیکولرازم کی طرف جارہا ہے۔ کتب احادیث میں ''کتاب الفتن و کتاب الملاحم'' سے مراد جنگوں کا باب ہے۔ ان میں خاص طور پر ''الملحمة العظمیٰ'' کا ذکر ملتا ہے جو تاریخ کی عظیم ترین جنگ ہوگی۔ اس کے علاوہ احادیث میں علامات قیامت' خروج دجال' عرب میں حکومت مہدی کا ظہور' مشرق سے فوجوں کی آمد' آسمان سے حضرت مسیح کا نزول' اس کے نتیجے میں یہود کا استیصال اور پھر عالمی سطح پر اسلام کے نظام خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کی پیشین گوئیاں موجود ہیں۔ یہ وہ حالات ہیں جو میرے اندازے میں تو زیادہ دور نہیں ہیں' قرائن و شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ بہت قریب پہنچ چکا ہے۔

ذات باری تعالیٰ کو کس نے دیکھا ہے۔ بس اس کی آیات ہی سے تو اسے پہچانا جاتا ہے۔

حق مری دسترس سے باہر ہے
حق کے آثار دیکھتا ہوں میں

اسی طرح جو پیش آنے والے حالات ہیں اور قیامت سے قبل کی جو علامات ہیں' نبی اکرم ﷺ نے ان کو وضاحت سے بیان فرمادیا ہے۔ چنانچہ دیکھنے والے ان کو دیکھ رہے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بساط بچھ رہی ہے' جیسے کسی ڈرامے کے لئے سٹیج تیار کیا جاتا ہے اور سامان فراہم کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد

جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ درحقیقت دو مسلمان امتوں کی سزاؤں کی آخر قسطیں ہیں جو کہ اب آنے والی ہیں۔

ایک اصولی بات اور سمجھ لی جائے کہ تاریخ میں جو بڑے بڑے حادثات و واقعات رونما ہوتے ہیں ان کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ ظاہر میں کون کون سی قوتیں اور عوامل کارفرما ہیں' باطن میں اصل حقیقت کیا ہے اور مشیت ایزدی کس طور سے اپنا ظہور کررہی ہے' یہ دو چیزیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ بسا اوقات ظاہری اعتبار سے جن چیزوں کی' جن واقعات و حادثات کی بہت اہمیت ہوتی ہے' باطنی اعتبار سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اسی طرح باطنی اعتبار سے جن امور کی اہمیت ہوتی ہے وہ ظاہری اعتبار سے اہمیت کے حامل نظر نہیں آتے۔ اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ جن حالات میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی ہے اس وقت کی دنیا نے اس واقعہ کی اہمیت کو کیا سمجھا ہوگا؟ دنیا کے ایک چھوٹے سے کونے میں' جزیرہ نمائے عرب کے لق و دق صحرا میں ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ پھر اس واقعہ نے آگے چل کر انقلاب برپا کردیا۔ مگر دنیا پر اس کا یا اس کے نتیجہ میں برپا ہونے والے انقلاب کا فوری اثر کیا ہوا ہوگا۔ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی دنیا میں آباد انسانوں کی اکثریت نے اس کا کیا نوٹس لیا ہوگا؟ لیکن معنوی اعتبار سے یہ کتنا اہم واقعہ تھا۔ حضور ﷺ کی بعثت انبیاء و رسل کے سلسلہ کا خاتمہ اور تکمیل ہے۔ اس بعثت کی وجہ سے روئے ارضی پر کتنا بڑا انقلاب برپا ہوا؟ اگرچہ اس وقت کے حالات و واقعات میں کچھ دوسری قوتیں زیادہ مؤثر نظر آتی ہیں' حقیقت میں باطنی معاملہ تو ''مشیت ایزدی'' کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جو قانون ہے' اس کی جو سنت ہے' یہ واقعہ اس کا ظہور ہے۔ اور جیسا کہ اس سے قبل کہا گیا مسلمان امتوں پر بھی عذاب آتا ہے اور کافروں سے بڑھ کر عذاب آتا ہے' مگر کفار کے ضمن میں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ وہ کافر جن کی طرف براہ راست کوئی رسول آیا ہو اور رسول کی طرف سے اتمام حجت کے باوجود وہ ایمان نہ لائیں تو ایسے کافروں کو کوئی رعایت نہیں ملتی۔ لیکن ان کے علاوہ وہ کفار جن پر کسی رسول نے براہ راست حجت پوری نہیں کی' اُن پر دنیا میں کوئی عذاب نہیں آتا۔ ان کا سارا معاملہ آخرت میں ہی چکایا جائے گا۔ اس دنیا میں سزا رسولوں کی امتوں کو ان کے اعمال اور قول و فعل کے تضاد کی بنیاد پر ملتی ہے۔ سورۂ صف میں ہے۔

''اے اہل ایمان کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں! ناراضی کے لحاظ سے اللہ کے نزدیک یہ بات بہت بڑی ہے کہ وہ کہو جو کرتے نہیں ہو۔''

اس بات کا تجزیہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ ایک قوم مدعی ہے کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں' اس کے رسول کو مانتے ہیں' اس کی کتاب کو مانتے ہیں اور اس کی شریعت کو مانتے ہیں' مگر یہ سب کچھ ماننے کے بعد عمل نہیں کرتے یا عمل کرتے ہیں تو جزوی طور پر۔ اپنے اس طرز عمل کی وجہ سے وہ مسلمان امت جو زمین پر اللہ کی نمائندگی کے منصب پر فائز تھی اس نے الٹی نمائندگی شروع کردی ہے۔ یہ امت اب خالق اور مخلوق کے درمیان حجاب بن گئی ہے۔ دنیا ان کو دیکھتی ہے اور انہی کے حوالے سے دین کو سمجھتی ہے۔ اس وقت یہ امت مخلوق خدا کو دین کی طرف لانے کے بجائے اس سے لوگوں کو متنفر کررہی ہے۔

اپنے اس طرز عمل اور غلط نمائندگی کے باعث یہ کافروں سے بڑھ کر مجرم اور زیادہ شدید سزا کی مستحق بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت محمد ﷺ کی بنائی ایک مغضوب اور ملعون قوم یہود کے ہاتھوں ہورہی ہے اور مزید ہوگی۔

قارئین توجہ فرمائیں

زیر نظر شمارہ ''تیرہ سو سالہ خدمات دیوبند کانفرنس'' کے حوالے سے خصوصی اشاعت کی حیثیت رکھتا ہے اور ''ندائے خلافت'' کی دو اشاعتوں کے قائم مقام ہے۔ گویا یہ شمارہ بالفعل ۱۵ تا ۱۸ اپریل کے دورانیے پر محیط ہے (ادارہ)

پی ٹی وی
اسلامی روایات سے دوری کا سبب

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

ٹیلی ویژن ایک مفید اور موثر ایجاد ہے جو عظیم مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے۔ یہ تشہیر واشاعت کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس کی بدولت معاشرے کو Educate کیا جاسکتا ہے۔ اگر اس کا کنٹرول اچھے ہاتھوں میں ہو تو معاشرے میں صحت مند تبدیلیاں لانا کچھ مشکل نہیں۔ اس کے برعکس اگر ٹیلیویژن کے پروگرام بامقصد نہ ہوں تو ناظرین کو بھونڈی تفریح اور تضیع اوقات کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اور اگر بے مقصد ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے پروگرام بے راہ روی' جرائم اور فحاشی پھیلانے والے بھی ہوں تو معاشرے کو غلط راہ پر جانے سے کوئی بھی دوسرا ذریعہ روک نہیں سکتا۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ پاکستان ٹیلی ویژن کے بیشتر پروگرام اسلام کے نام پر قائم ہونے والی مملکت میں غیر صحت مندانہ رجحانات پیدا کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو اسلام سے دور لے جانے میں مؤثر ثابت ہو رہے ہیں۔ فحاشی کی تشہیر پر مبنی فلمیں اسلامی ثقافت کی بجائے بنیادی اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف مادر پدر آزاد ماحول پیدا کر رہی ہیں جس کے نتیجہ میں جنسی بے راہ روی عام ہو رہی ہے اور خاندانوں کے اندر سے شرم وحیا رخصت ہو رہی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مغربی تہذیب اپنی پوری گندگی کے ساتھ پاک سرزمین میں درآمد ہو رہی ہے۔

فلموں کے علاوہ Entertainment کے نام پر کچھ ڈرامے بھی پیش کئے جاتے ہیں جن میں جوان لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ چلتے' تنہائی میں ملاقاتیں کرتے اور عشقیہ گفتگو میں مصروف دکھایا جاتا ہے۔ یا پھر ان ڈراموں میں قتل کرنے کے انداز' ڈاکے کے مناظر' بینک لوٹنے کی کامیاب وارداتیں دکھائی جاتی ہیں۔ جس سے نوجوان نسل جنسی بے راہ روی کا شکار ہو کر خاندانوں کے لئے پیچیدگیاں اور تباہی و بربادی کا سامان پیدا کر رہی ہے۔ نیز بے روزگار تعلیم یافتہ مایوس نوجوان جرائم کا رخ کر رہے ہیں۔ اخبار بین حضرات جانتے ہیں کہ ہمارے اخباروں کے صفحے جرم و سزا کے عنوان سے شائع ہوتے ہیں۔ جنسی تشدد' اغوا اور ماں باپ کی مرضی کے خلاف عدالت میں نکاح کا رجحان روز افزوں ہے۔ مختصر یہ کہ پاکستان ٹیلی ویژن عوام کو تفریح کے نام پر خدا فراموش ثقافت سے قریب اور اسلامی تعلیمات سے دور کرنے کے علاوہ اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں پوری طرح مصروف عمل ہے جس کی تمام تر ذمہ داری ان افراد پر آتی ہے جن کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے اور وہ ہیں بھی مسلمان' یعنی رسول خدا ﷺ کے امتی اور ان کی شفاعت کے امیدوار ذرا تصور کیجئے کہ اگر آج محبوب خدا ہمارے درمیان موجود ہوں تو اس بے حیائی کی تشہیر پر کس رد عمل کا اظہار کریں گے۔ اگر وہ ناراض ہوں' اور یقیناً ناراض ہوں گے تو کیا ہمارے لئے ان کی ناراضگی قابل برداشت ہو گی۔ العیاذ باللہ۔ جب کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ لوگ رسول کی مخالفت ہرگز نہ کریں۔ دیکھئے سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۱۵ : "ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد جو کوئی رسول کی مخالفت کرے گا اور مسلمانوں کی راہ کے علاوہ کسی دوسری راہ پر چلے گا تو ہم اس کو اسی طرح موڑ دیں گے جس طرح وہ مڑا اور ہم اس کو جہنم رسید کریں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے"۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پی ٹی وی اسلامی ثقافت اور اسلامی روایات کی اشاعت کیوں نہیں کرتا؟ کیا اسلامی ثقافت ناقص اور نامکمل ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی روایات پیش کرنے میں اہانت اور سبکی محسوس کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ کوئی باخبر شخص اس کو ماننے پر تیار نہیں' کیونکہ اسلامی تاریخ جرأت و بہادری' عزم و استقلال کی پائیداری' ایثار و قربانی اور دیانت و امانت کے درخشندہ واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ہمیں اپنی تہذیب میں کون سی خامی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے ہم اس کی اشاعت سے گریزاں ہیں۔ اگر ہماری تہذیب ہر دوسری تہذیب و ثقافت سے برتر ہے' اور یقیناً ہے' (کیونکہ اس کے اصول اور قواعد و ضوابط خالق کائنات نے مقرر کئے ہیں جو خود انسان کا خالق ہے) تو ہمیں اپنی تہذیب وثقافت پر معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے کی بجائے فخر کرنا چاہئے اور اسلام کی سنہری روایات کی ترویج و اشاعت کر کے ایک پاکیزہ اور پر امن معاشرہ قائم کرنے کی کوشش میں لگنا چاہئے' جو حریت اور انصاف کی بنیادوں پر استوار ہو جہاں مسلمان اسلامی بھائی چارے پر مبنی خوشگوار تعلقات کے ساتھ زندگی گزاریں اور دوسروں کے لئے مثال بنیں۔

ڈرامے دکھائے جائیں مگر ان میں اخلاق کی بلندی' کردار کی عظمت کی روشن مثالیں پیش کی جائیں۔ نیکی کرنے والے کا انجام کار کامیابی اور خوشحالی سے ہمکنار دکھایا جائے اور برائی کرنے والے کو نتیجہ کے طور پر مصائب و آلام اور مشکلات کا شکار دکھایا جائے۔ حرام ذرائع سے روزی کمانے والوں کی عبرت کے لئے ایسے واقعات دکھائے جائیں جہاں رشوت اور بددیانتی کے ذریعے کمائی ہوئی دولت کو مصیبت کا باعث بنتے دکھایا جائے۔ اس طرح معاشرے کے بلند کردار لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوگی اور نیکی پھیلے گی جبکہ بددیانت لوگوں کی حوصلہ شکنی ہوگی اور گناہ کا انجام بد لوگ اپنی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ ڈرامہ نویس تو ٹی وی کے ارباب حل و عقد کا مزاج دیکھتے ہیں۔ جس طرح کے ڈرامے وہ پسند کریں گے اسی طرح کے وہ لکھ دیں گے۔ بددیانتی کے ذریعہ کمائی ہوئی دولت ضائع ہونے کے سلسلہ میں اس طرح کی کہانی پیش کی جاسکتی ہے کہ ایک گوالا دودھ میں پانی ملا کر بیچتا تھا' اس طرح اس نے بہت سی دولت اکٹھی کر لی ایک دن وہ دولت کو تھیلے میں سمیٹے سفر پر نکلا۔ راستے میں نہر کے کنارے ایک درخت کی چھاؤں میں لیٹ گیا اور تھیلا سر کے نیچے رکھ لیا۔ جب وہ نیند کی وجہ سے غافل ہوا تو ایک بندر اس کا تھیلا لے اڑا۔ جب وہ جاگا تو تھیلا گم پایا۔ ادھر ادھر دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا۔ نظر اوپر اٹھائی تو درخت پر بندر تھیلا لئے بیٹھا تھا۔ اس سے تھیلا مانگا اور منت سماجت کرنے لگا۔ اس پر بندر نے تھیلے کا منہ کھولا' ایک سکہ گوالے کی طرف اور ایک نہر میں پھینکنے لگا۔ اس پر گوالے نے نصیحت پکڑی کہ پانی کی کمائی نہر میں پڑ کر ضائع ہو گئی جب کہ دودھ کی کمائی اس کے پاس رہی۔ اس طرح کے ڈرامے جہاں تفریح مہیا کریں گے وہاں معاشرے کو صحیح سمت میں Educate بھی کریں گے۔

اسلام میں شرم وحیا کی بڑی اہمیت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حیا کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے۔ عورت کا زیور حیا ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک حیا کے لباس میں ملبوس ہونی چاہئے۔

عورت کے خدوخال کے نمائش کی اسلام میں قطعاً گنجائش نہیں۔ اسلامی تہذیب و ثقافت میں ہمارے پیارے نبی مکرم ﷺ کی صاحبزادیاں اور ازواج

encouraging the dilution of Muslim political expression, religious parties need to reduce the national discourse to Islamic state versus secularism. They must not encourage competition for votes and political spoils. There must emerge an Islamic vote bank -- if participation in the political process is inevitable, unclassified into a proliferation of Islamic parties, which only divides the Islamic vote, form a variety of alliances, and thereby diffuses the challenge of Islamic revival against the puppet regimes. Religious parties joint-mission under Pakistan Defence Council should be one of reawakening and deliverance from the Western web. Their goal should be freeing the Islamic homeland from all foreign authority and remote-control-colonialism, for this is a natural right belonging to every human being which only the unjust oppressor will deny. Merely contesting elections and wining a few seats by each religious party will never help us establish an Islamic state within this homeland, which acts according to the precepts of Islam, applies its social regulations, advocates its sound principles, and broadcasts its mission to all of mankind. This is the time for them to join hands, develop a strategy and say no to further exploitation in guise of separate parties, separate seats and continued rule of the Western puppets with or without the much vaunted democracy and elections. Let's not sell the long deferred dream of a true Islamic state in Pakistan for a few seats in national assembly and a little personal aggrandizement.

END NOTES:

[1] For a discussion of this issue in the case of Algeria, see John Entelis, "The Crisis of Authoritarianism in North Africa: The Case of Algeria," Problems of Communism 41 (May-June 1992): 71-81.

[2] For a discussion of this issue in the case of Algeria, see John Entelis, "The Crisis of Authoritarianism in North Africa: The Case of Algeria," Problems of Communism 41 (May-June 1992): 71-81.

[3] On routinization of Iran's revolution, see Fouad Ajami, "Iran: the Impossible Revolution," Foreign Affairs 67 (Winter 1988/89): 135-55: Ruhollah K. Ramazani, Revolutionary Iran (Baltimore: John Hopkins University Press, 1988); and Shireen T. Hunter, Iran After Khomeini (New York: Praeger, 1992).

[4] Like LUMS Lahore recently held seminars to prove that Islam was not the rallying force behind the creation of Pakistan and Pakistan needs to be a secular state to survive in the new century.

[5] See the recent anti-religious parties, the Taliban and Jihad groups articles in the Pakistani English press, and also see Leslie Gelb, "The Free Elections Trap," New York Times, 29 May 1991; and Bernard Lewis, "Islam and Liberal Democracy," The Atlantic, February 1993, 89-98.

[6] Fred R. von der Mehden, Religion and Modernization in Southeast Asia (Syracuse, NY: Syracuse University Press, 1986), 1-98; end Donald Eugene Smith, Religion and Political Development (Boston: Little, Brown, 1970). The linkage between secularism and democracy is most clearly presented in Samuel P. Huntington, The Third Wave: Democratization in the Late Twentieth Century (Norman: University of Oklahoma Press, 1991), 298-311.

[7] Freeland Abbott, Islam and Pakistan (Ithaca, NY: Cornell University Press, 1968), 193.

[8] Nasr, S.V.R., assistant professor of political science at the University of San Diego and associate of the von Grunebaum Center for Near East Studies at University of California, Los Angeles, also believes the same in his article "Islam and Politics)" (v110 n2) Start Page: p261(25) ISSN: 0032-3195

(The author is a former columnist for the Nation, the Muslim and the Frontier Post.)

مطہرات شرم و حیاء کا کامل نمونہ تھیں۔ وہ پردہ دار خواتین تھی۔ رسول اللہ ﷺ سے قریب ترین نسبت کی وجہ سے ان کا کردار انتہائی پاکیزہ تھا' مگر اس کے باوجود قرآن میں ان کو مخاطب کر کے کہا گیا کہ اپنے گھروں کے اندر قرار پکڑو اور جاہلیت کی زیب و زینت کی نمائش نہ کرتی پھرو۔ اسلام کے سنہری دور میں عورتوں کے بے پردہ باہر نکلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انہی عورتوں نے حضرت حسینؓ جیسے مجاہد اور عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے منصف پیدا کئے۔

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

"حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بن اور زمانے کی نظر سے اوجھل رہ' یعنی پردہ اختیار کر! تاکہ تیری گود میں حسینؓ پرورش پائیں"۔

صاف ظاہر ہے بے حیا عورت باکردار افراد کو کیسے جنم دے گی۔ خود بے حیا ہونا تو درکنار بے حیائی پھیلانے والوں کو بھی دردناک عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ دیکھئے سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلے ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔" کیا عورتوں کا زیب و زینت کے ساتھ ناچنا گانا اور ٹیلی ویژن کے ذریعے اس کو گھر گھر دکھانا بے حیائی نہیں ہے۔ یہ بے حیائی کون پھیلا رہا ہے! اور اس کی ذمہ داری کس پر آتی ہے!

☆ نظام خلافت کیا ہے؟
☆ یہ کن بنیادوں پر قائم ہوگا؟
☆ عہد حاضر میں نظام خلافت کا دستوری' قانونی' معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ کیا ہوگا؟
☆ اس کے قیام کے لئے سیرت نبویؐ سے ماخوذ طریق کار کون سا ہے؟

ان تمام سوالات کے جامع' واضح اور مدلل جوابات پر مشتمل ایک بیش قیمت علمی دستاویز

"خطباتِ خلافت"

امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان
ڈاکٹر اسرار احمد کے چار خطبات کا مجموعہ

سفید کاغذ' عمدہ طباعت' صفحات ۲۱۲' قیمت (اشاعت عام): ۴۵ روپے
ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

بقیہ: تجزیہ

شکار ہو جائے۔

ہم اپنے اس موقف کا بارہا اظہار کر چکے ہیں اور اس کے درست ہونے پر ہمارا قوی ایمان ہے کہ پاکستان کا استحکام تو دور کی بات ہے' نفاذ اسلام کے بغیر پاکستان کے وجود کا برقرار رہنا بھی انتہائی دشوار ہے۔ جو لوگ پاکستان میں اسلام کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ دین دشمنی کے ساتھ ساتھ قوم اور ملک سے بھی بدترین دشمنی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

قومی فریضہ ہے کہ ہم قوم کو غفلت سے بیدار کریں' اسے حقیقی خطرہ سے آگاہ کریں اور اسے اس خطرے سے نمٹنے کے لئے تیار کریں۔ ایسا نہ ہو کہ قوم بے خبری میں کسی مصیبت کا

presenting religious parties like Jama'at's history as a clear example of the limits to the challenge posed by Islamic revival in a bid to prove that pluralism can successfully withstand the challenge of Islamic revival. By forming Pakistan Defence Council, all religious parties need to effectively address the root causes of the fact that throughout Pakistan's history, such parties have been ideologically significant and politically consequential, but despite five decades of indefatigable activism they have not been able to translate their power into control of the state and the political process for materialising the dream of a true Islamic state. This fact must not cast doubt on popular notions about the power and reach of Islamic revival movements, especially in an open political process. Failure of the divided religious parties to secure more seats by no means provide clues about the working of an Islamic movement and its potential in light of the constraints imposed on their operation; nor does this process shed any light on the dynamics of interaction of religion with politics, ethnic conflict, and democratisation. Religious parties are an invincible force in the political process in the country provided they realise their goal and strength, and channel their combined energy in a productive manner. In the words of Freeland Abbott, "In the view of government leaders a viable Pakistan could not develop under the political leadership of the mullah [religious divine]; on the other hand, a strong Pakistan was not likely to develop without their help. The central government both wooed the mullahs and ridiculed them." [7] Religious parties need to break this ambivalence by coming out of the circle of their narrow interests and having a broad look at the history of Pakistan and the role they have played so far. The Western governments want governments like Pakistan to ensure only protracted and divided involvement of religious parties with the political process because it is the only way to create barriers to further progress of Islamic revival and immunise the political process to its ultimate challenge. So far, it seems that religious parties have played well in their hands. It is believed that this strategy will compel Islamic revival to turn to pragmatic (Godless) politics in lieu of ideological posturing. Similarly, it would enable the state to formulate policies that would accommodate dissent at the expense of Islamic revival. Even though religious leaders have by and large responded positively to the burgeoning democratisation process in many parts of the Muslim world and become involved with the political process. But the reaction to this development in the ruling regimes in the Muslim world and among Western policy makers and academicians has not been positive, nor have the religious groups reap any fruits of their joining the democratic process under split banners. Rather than extend the demand for democratisation to the Muslim world, many argue that it is better for Muslim states to languish under military rule, sell-out politicians, sheikhs and Amirs, rather than adopt an open political system susceptible to revival of Islam, implying that democracy is not an appropriate form of government if the people do not vote for secular parties, or if the elected officials do not work as puppets of Washington and London. Some religious leaders like Dr. Israr Ahmed in Pakistan rightly argue that the long run involvement with the political process impedes the development of Islamic revival and realisation of a true Islamic state.[8] Islamic revival is an imminent threat to a state lacking the will or power to say no to Western dictates. Far from a proof of the "inevitability" doctrine, the Iranian revolution owed its success to the Shah's pro-Western policies, repression and inability to release himself from the foreign clutches.

Similarly, lack of coordinated and joint effort on part of all religious leaders and parties is the main reason behind defeat of Islamic revival in Iraq in 1980, Syria in 1982, and Algeria and Tajikistan since 1992. While unity of religious parties explains success of Islamic revival movement, it is a far more effective means of contending with secular political activism than contending elections against each other. Disjointed actions and individual efforts of different religious groups, as witnessed in Iraq, Syria, Algeria, or Tajikistan are costly affairs that can scar and derail the revival effort. The brutality suffered in anti-religious parties campaign by different governments can in many cases outweigh the dangers that are perceived to entail further strengthening of the puppet regimes. Pakistani government must also keep in mind that in some cases, such as Iran in the 1960s and 1970s, and again in Algeria since the coup, suppression of Islamic revival will lead to its strengthening and will convert a political movement into a revolutionary one, which in time could produce a far more intractable problem for the puppet regimes than merely allowing the religious parties to have a say in the state affairs. The recent formation of the Afghan Defence Council and collective action of all religious parties against the UN sanctions against Afghanistan is tantamount to this fact. We have to take note of the fact that wherever possible, an open political process is used to contend with Islamic revival through encouraging competition among religious parties to the advantage of other political actors. The separate political party system has meant that each religious party has been unable to create barriers to entry of other Islamic forces into the political arena, thereby monopolizing the Islamic vote bank. Religious parties need to monopolize the fruits of their toil and the enthusiasm which their politics has generated. Instead of

VIEW POINT.

Let's form Pakistan Defence Council.

Abid Ullah Jan

The impact of Islamic revival on political development in the Muslim world in general and interests of the West in particular has been the subject of heated debates among Western media pundits and policy makers alike. Islamic revival is viewed as a revolutionary force whose aim is to topple the established order in the Muslim world, be they authoritarian or democratic [1]. In view of the secular onslaught on religious leaders and institutions, Islamic parties in the Muslim countries need to forge alliances, chalk out elaborate strategies and cross this crossroads in a very careful and planned manner if they want to avoid Algerian kind of eventuality. Why should not we think about the formation of Pakistan Defence Council to get rid of the internal and external oppressors if joining hands by all religious parties could form Afghan Defence Council to counter the foreign intervention alone. It is evident that the prospects of additional Islamic revolutions and republics are totally unacceptable to the West. To the Western satisfaction, it is also evident that secular, pro-Western states in the Muslim world, through oppression are by and large staying their ground and in large measure containing Islamic revivalism. However, crises of governability, which create circumstances that are conducive to the growth of Islamic revival, persist and religious leadership has to fill the vacuum.[2] Many governments, like that of Benazir Bhutto and Hosnie Mubarak have thus far cashed themselves by presenting themselves as secular bulwarks successfully dealing with revolutionary challenges to the Western hegemony through Islamic revival. Apart from Egypt, Algeria, Turkey, and Indonesia, a host of other Muslim countries have also resorted to brute force to contain Islamic revival. In the meantime, state-sponsored experiments with Islamisation in Bangladesh and Pakistan have almost ended and there is no light at the end of dark tunnel we are passing through. Iran is considered as a ghost of its 1979-1980 existence.[3] The Western calls for democracy, however, have renewed concern over state repression against religious groups and their activities. As the Islamic parties appear poised for greater participation in the national and international affairs, threatening the oppressive and sold out state structures that have contained Islamic revival to date, the future of the secular state has come into question. Together with media, many groups and institutions [4] in Pakistan have recently started a concerted campaign against religious parties and their activities in Pakistan. In such circumstances, it would be unwise to believe that democracy will open the political process to the revival of Islam and provide it with a new avenue through which it can pursue its political agenda. As secularism is commonly viewed as a prerequisite for viable democracy, the increased participation of religious parties in the national and international affairs is viewed with alarm. [5] It is argued that in Muslim countries democratisation will sow the seeds of its own demise by giving religious parties a handle to monopolize the political discourse and possibly take over power. As a result, fear of Islamic revival has led to ambivalent responses to Muslim societies' experiments with greater pluralism. Western policy makers and academicians have viewed democratisation in Muslim societies with suspicion; and in cases such as that of Algeria or Tunisia, they have actually ignored popular aspirations and tacitly approved of government crack-downs or even military coupe. In similar vein, in no uncertain terms, most observers have endorsed the creation of authoritarian republics by old commissars and former Communist party bosses modelled after Turkey in the newly-created Central Asian states. Succinctly put, given dangers inherent in democratisation, Muslims are better off under secular dictators. Such suppositions reflect a fear of Islamic revival and an absence of confidence in the ability of democracy to contend with the challenge of practical Islam. In this regard, the prevailing anti-religion attitudes also bear the influence of the modernization perspective in associating development, especially in the direction of democracy with secularization.[6] This reflects the feebleness of democracy before the challenge of Islamic revival. All that religious parties need to do is to remove the misconceptions that parties like Jama'at-i-Islami are far less effective in reviving Islam than their rhetoric, which calls for an Islamic revolution and the creation of an Islamic state in Pakistan. Western analysts never get tired of

Vol : 10 Regd. CPLNo. 127 No. 12

WEEKLY **NIDA-I-KHILAFAT** LAHORE

پاکستان کے مذہبی' دینی اور جہادی قائدین

اور ملک کے انتظامی' دفاعی' اور عوامی حلقوں کے دینی عناصر

توجہ فرمائیں!

✪ پاکستان اسلام کے نام پر قائم کیا گیا تھا' ـــــ اور

✪ اسلام کے سوا اس کے استحکام کی کوئی بنیاد ہرگز موجود نہیں!

✪ مزید برآں بائبل اور قرآن و حدیث کی پیشین گوئیوں کی رُو سے حق و باطل کا جو عظیم معرکہ مستقبل قریب میں ہونے والا ہے پاکستان کو اس میں افغانستان کے شانہ بشانہ فیصلہ کن کردار ادا کرنا ہے!

لیکن افسوس!

کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک و ملت کی زمامِ کار ہے ـــــ وہ نہ صرف یہ کہ ان حقائق سے بے خبر ہیں بلکہ بے سمجھے بوجھے عالمی صیہونی تحریک کے برپا کردہ عظیم دجالی فتنے کے آلۂ کار بن گئے ہیں!!!

ـــــــــ چنانچہ : ـــــــــ

❶ ایک جانب ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے ساتھ پوری "وفاداری بشرطِ استواری" کا معاملہ کرتے ہوئے ملک اور قوم پر سودی قرضے کا بوجھ' گویا عالمی مالیاتی استعمار کے شکنجے کی گرفت روز بروز بڑھواتے چلے جا رہے ہیں ـــــ اور

❷ دوسری جانب پہلے قاہرہ' پھر بیجنگ اور بالآخر یو این او کی جنرل اسمبلی کی بیجنگ پلس فائیو کانفرنس کے "سوشل انجینئرنگ پروگرام" کے شیطانی ایجنڈے کی تکمیل کی خاطر ملک اور قوم کو مخلوط معاشرت' جنسی آزادی' اور خاندانی نظام کی بربادی کی جانب دھکیل رہے ہیں' جس کے اہم ترین مظاہر ہیں :

① بلدیاتی انتخابات میں تہائی نشستیں خواتین کے لئے وقف کرنا ② ہندو تہوار (بلکہ ایک روایت کی رو سے ایک شاتم رسولؐ کی یادگار) بسنت کو "جشن بہاراں" کا نام دے کر سرکاری سرپرستی اور کروڑوں کے اخراجات' اور

③ پی ٹی وی کا عریانی اور فحاشی میں زی ٹی وی اور بھارت کے دوردرشن کو بھی مات دے دینا!!

تو کیا عوام و خواص کے دینی عناصر یہ سب کچھ چپ چاپ دیکھتے رہیں گے؟

اور پاکستان کی مذہبی اور دینی جماعتیں اپنی فرقہ وارانہ اور سیاسی مصلحتوں ہی میں گرفتار رہیں گی ـــــ اور جملہ جہادی تحریکیں بھی صرف بیرون پاکستان مصروف پیکار رہیں گی؟؟ یا تہدید قرآنی: ﴿ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ﴾ (یعنی : "ڈرو اس عذاب سے جس کی لپیٹ میں صرف غلط کار لوگ ہی نہیں آئیں گے" الانفال:۲۵) ـــــ اور فرمان نبویؐ: "فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ" (یعنی : "جو شخص ان غلط کار لوگوں کے خلاف ہاتھ سے یعنی طاقت کے ساتھ جہاد کرے گا وہ مومن ہو گا' اور جو کوئی زبان سے جہاد کرے گا وہ بھی مومن ہو گا"۔) سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے باہم متحد ہو کر "نہی عن المنکر باللسان" تو فوراً شروع کر دیں گی اور مناسب قوت کے حصول کے بعد "نہی عن المنکر بالید" کے بارے میں بھی غور کریں گی؟؟

وقت آپ کے جواب کا شدت سے منتظر ہے!!

خادم اسلام : خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ' امیر تنظیم اسلامی